صائمہ

لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد ایوب

صائمہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

انتساب

اہل وطن کے نام جو کاروباری سیاستدانوں اور خودغرض حکمرانوں
کو نجات دھندہ تصور کیے
امن، عدل اور خوشحالی کی امید پر زندہ ہیں۔

کاروباری طبقہ دنیا کا خطرناک ترین طبقہ ہے جو ہر وقت مکار لومڑیوں اور خونخوار بھیڑیوں کی طرح اپنے شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسکا دین وایمان، اخلاق، اخلاص، اُنس و محبت اور پیار منافع خوری کے دائیرے میں مقید ہوتا ہے۔ یہ طبقہ نہ دوستی کرتا ہے اور نہ دشمنی مول لیتا ہے۔ وہ صرف سستے داموں عمدہ مال خریدتا اور گھٹیا مال مہنگے داموں بیچتا ہے۔ وہ نہ منصف ہوتا ہے اور نہ ہی مصلح۔ خستہ حال ریاست اور بکھرا ہوا معاشرہ کاروباری لوگوں کے لیے دنیا میں سب سے بڑی منڈی ہے۔ ایسی ریاست اور معاشرے میں بسنے والے لوگ اپنا سب کچھ بیچنے کو تیار ہوتے ہیں بشرطیکہ اُنھیں پیٹ بھرنے کے لیے روٹی مل جائے۔

کاروباری طبقہ اگر اقتدار پر قابض ہو جائے تو وہ سب سے پہلے ملک دشمنوں کو اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت دیتا ہے اور عوام کو خوشحالی کی امید دلا کر اُنھیں لوٹ لیتا ہے۔ وہ محصولات میں اضافہ کرتا ہے اور محاصل اپنے کاروباری دوستوں اور خاندان پر خرچ کرتا ہے۔ ایسے حکمرانوں کے دور میں عوام فاقے کرتے ہیں تاکہ چند لوگ عیش وعشرت کی زندگی بسر کر سکیں۔

"دولباخ"

انسانوں کے بنائے قوانین کا خالصتاً یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ریاست اور معاشرے میں عدل وانصاف قائم ہو۔قانون بناتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے کہ مفاداتی طبقے کے حقوق پر کوئی آنچ نہ آئے اور برسر اقتدار طبقہ قانون کی آڑ میں اقتدار پر قابض رہے۔نظریاتی پہلو سے بے شک قانون کا مقصد عدل وانصاف کا قیام ہی ہوتا ہے مگر عملاً ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔قانون کا واحد مقصد مقتدر اعلیٰ کو تحفظ اور مراعات یافتہ طبقے کو سہولیات فراہم کرنا ہے۔قانون کبھی بھی چرواہے اور جاگیر دار کیساتھ یکساں انصاف نہیں کرتا۔ چرواہے کی بکریاں اگر جاگیردار کے کھیت میں چلی جائیں تو اسے سزا ملتی ہے۔جاگیردار جسقدر چاہے زمین پر قبضہ کرسکتا ہے چونکہ زمین نہ عوام اور نہ ہی خدا کی ملکیت تصور ہوتی ہے۔قانون کی نظر میں زمین کا مالک بادشاہ اور حکومت ہے۔عوام کا کام قانون کا احترام کرنا ہے جو بادشاہ، حکومتی کارندے اور جاگیردار ملکر بناتے ہیں۔قانون صرف اس لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کا قلع قمع کر دیا جائے جو عام سطح سے بلند ہوکر سوچتے ہیں اور موجودہ صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسے لوگ سیاسی مجرم اور ملک دشمن تصور کیے جاتے ہیں جن کی سزائیں قانون کی کتابوں میں لکھ دی گئی ہیں۔قانون عوام کو حکمرانوں کی تابعداری پر مجبور کرتا ہے۔قانون بنانے والی مجلس کا سربراہ حکمران ہوتا ہے اور اسی کے نام سے قانون کا اجراء ہوتا ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ عدل ومساوات اور انسانی حقوق اور آزادی پر تقریریں کرنیوالے اور قانون کی کتابیں لکھنے والے دانشور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کر سکے جو سب انسانوں کے لیے برابر ہو اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے پاک ہو۔

"لیوٹالسٹائی"

(۱)

آج وقت نہیں دے سکتا آپ کل تشریف لائیں۔آج میں تین گھنٹے صائمہ کیساتھ مصروف ہوں میں نے اسے وقت دے رکھا ہے۔ابھی پروفیسر صاحب نے فون پر بات ختم کی ہی تھی کہ خلیفہ نے سوال کیا جناب صائمہ کون ہے؟ صائمہ جو بھی ہو خلیفہ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے تھی چونکہ میں اور خلیفہ خود وقت لیکر پروفیسر اللہ لوک سے ملنے گئے تھے۔دو ہفتے پرانی بات ہے کہ کباڑی بازار میں ایک شرابی نے اعلان کیا کہ پروفیسر اللہ لوک کی دعا میں قبولیت ہے۔جاؤ اور اپنی جائز حاجات کی دعا کیلئے درخواست کرو۔رب تعالیٰ آسانیاں پیدا کریگا۔میں نے خلیفہ سے بات کی تو کہنے لگا کہ میں نے بھی پروفیسر کے متعلق سن رکھا ہے بلکہ دیکھا بھی ہے مگر بظاہر پیروں فقیروں والی کوئی بات نہیں۔سنا ہے دس بارہ ماسٹر ڈگریاں حاصل کر چکا ہے۔بیوی، بچوں اور والدین کے ساتھ پرانی آبادی کے ایک پرانے مکان میں رہتا ہے۔بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر روزی کماتا ہے اور وقت کا پابند ہے۔اس کے شاگردوں کی بڑی تعداد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے مگر کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔اخبار میں بھی لکھتا ہے اور دھڑلے سے لکھتا ہے کسی سے ڈرتا نہیں۔کئی بار توہین عدالت کا سامنا کر چکا ہے مگر سچ بات کہنے سے ہٹتا نہیں۔وکیل بھی ہے مگر پریکٹس نہیں کرتا۔سگریٹ اور قہوہ بہت پیتا ہے اور باقی وقت خاموشی سے ذکر الٰہی میں گزارتا ہے۔زیادہ ملنے ملانے سے گریز کرتا ہے۔خاص کر عورتوں سے میل ملاپ اچھا نہیں سمجھتا۔پروفیسر کا خیال ہے کہ خواتین روائیتی پیروں فقیروں کے چکر میں ہوتی ہیں اور اکثر اپنے شوہروں یا پھر سسرالی رشتہ داروں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے تعویز گنڈے کروانے کے لئے آتی ہیں۔ایسا نہیں کہ پروفیسر ایم ایم اے کے بعض قائدین کی طرح دن کی روشنی میں خواتین سے ملنا غیر شرعی فعل سمجھتا ہو۔وہ ضرورت مند خواتین سے ملتا بھی ہے اور ان کا بے حد احترام کرتا ہے۔اس کے شاگردوں میں سکول کی بچیوں سے لیکر یونیورسٹی کی طالبات تک شامل ہیں۔سارے شاگرد ٹیوشن بھی نہیں دیتے۔وہ غریب اور ذہین بچوں کو نہ صرف مفت تعلیم دیتا ہے بلکہ ان کے دیگر اخراجات بھی برداشت کرتا ہے۔خلیفہ نے بتایا کہ پروفیسر حاجت مندوں سے نذر نیاز نہیں لیتا بلکہ انہیں اپنا مہمان سمجھ کر چائے پلاتا اور کھانے کے وقت جو روکھی سوکھی خود کھاتا ہے مہمانوں کو بھی پیش کرتا ہے۔

وہ آنے والے مہمانوں یا پھر حاجت مندوں کو پڑھنے کے لئے وظائف دیتا ہے اور نماز کی پابندی کی تلقین کرتا ہے۔پروفیسر اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ ہر آنے والے کا کام وظائف پڑھنے سے ہو جائے گا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو پیر یا ولّی اللہ کہتا ہے۔پروفیسر کا دعویٰ ہے کہ اس کا طالب علم اچھے نمبروں سے پاس ہوگا اور مقابلے کے امتحان میں بھی اچھی پوزیشن لے گا۔وہ مرادیں مانگنے والوں کو کہتا ہے کہ اس کے پاس ایسا کوئی نسخہ نہیں جس سے محبوب قدموں میں گر جائے اور دشمن پل بھر میں پگل کر موم ہو جائے۔البتہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ انگریزی اچھی پڑھا لیتا ہے اور اس کا پڑھایا ہوا ہر لفظ طالب علم کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔

خلیفہ کے دوست قسور خان نے کہا کہ اگر پروفیسر مراد پوری نہیں کرسکتا، عورتوں سے دور رہتا ہے، خاص مریدوں کو تخلیے میں نہیں ملتا۔نیاز نہیں لیتا تو پھر لوگ اسے ملنے کیوں جائیں۔پروفیسر کے ہاتھ کا بنا کڑوا قہوہ اور دال روٹی کھانے سے کیا فائدہ۔میں اسی شہر میں ایسے پیروں فقیروں کو جانتا ہوں جو عوام کی دن رات خدمت کرتے ہیں کسی کو وقت نہیں لینا پڑتا۔ ہر ایک کیلئے ان کے دروازے کھلے ہیں۔خواتین پردے میں بھی اور بے پردہ بھی ملتی ہیں۔جبکہ اونچی شلوار اور چھوٹی قمیض والی خواتین کی خاص پذیرائی ہوتی ہے۔لنگر جاری ہیں اور لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔مجھے بہت سی خواتین اور مردوں نے بتایا ہے کہ یہ لوگ پہنچے ہوئے ولی ہیں۔دل کی بات جانتے ہیں اور ہر کسی کو دل کی مراد ملتی ہے۔میں ایسے پیروں کو بھی جانتا ہوں جن کے آستانوں پر بڑے بڑے افسر، وزیر اور امیر حاضری دیتے ہیں۔حسب توفیق لوگ نذر نیاز بھی پیش کرتے ہیں اور ان گدی نشینوں اور مخدوموں کو اپنے ہاں برکت کے نزول کیلئے دعوتیں دیتے ہیں۔بعض پیر اور ان کے صاحبزادگان یورپ اور امریکہ تک اپنے مریدوں کے حاجت روائی کے لئے سفر کی کھٹن منازل بھی طے کرتے ہیں۔

قسور خان نے پروفیسر اللہ لوک کی مخالفت میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ پروفیسر صرف اچھی انگریزی پڑھاتا ہے باقی سب گپ شپ ہے۔اصل بات یہ ہے کہ پروفیسر کے پاس ایک جن تھا جسے اس نے غلہ منڈی سے قابو کیا اور پھر کچھ عرصہ تک یہ جن اس کے لئے کام کرتا رہا جس کی وجہ سے پروفیسر عوام میں مشہور ہو گیا۔دراصل جن خود ہی غلہ منڈی سے اس کے ساتھ آ گیا تھا۔یہ جن کوہستان کا رہنے والا تھا اور وہاں سے روپ بدل کر پشاور آیا تو اس کی ملاقات غلام علی سے ہو گئی۔ان دنوں غلام علی بھی دیر سے روپ بدل کر نیا نیا پشاور آیا ہوا تھا اور جن جو کہ انسانی روپ میں غلہ منڈی میں پانڈی کا کام کرتا تھا سے جان پہچان کر لی۔بعد میں غلام علی کی دوستی مولانا فضل الرحمٰن سے ہو گئی

اور وہ حج پر چلا گیا تو جن کو غلام علی کی حقیقت سمجھ آ گئی۔ جن کو حاجی غلام علی اور فضل الرحمٰن کی دوستی پر اعتراض تھا جیسے سلیم سیف اللہ کو دل ہی دل میں امیر مقام اور جنرل پرویز مشرف کی قربت پر اعتراض ہے مگر بول نہیں سکتا اور نہ ہی پارٹی بدل سکتا ہے۔ جن بہرحال جن تھا اس نے پارٹی بدل لی اور پروفیسر اللہ لوک کے ساتھ آ گیا۔ یہ جن بھی صائمہ کی طرح کھوجی طبیعت کا تھا۔ وہ انسانی روپ میں پاکستان کے غریبوں، مزدوروں اور انتہائی نچلے طبقے کے لوگوں پر تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اس تحقیق کیلئے اس نے حاجی غلام علی کا انتخاب کیا اور اس کے اندر داخل ہو کر اسے تحریک دی کہ وہ غریبوں اور مزدوروں کیلئے سیاست کرے مگر جن کے دخول سے حاجی غلام علی کو کچھ زیادہ ہی مسالہ لگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ فنا فی فضل الرحمٰن ہو گیا۔

حاجی غلام علی کو جن ایک صاف ستھرا مزدور اور غریب محنت کش لیڈر بنا کر غریبوں اور پسے ہوئے طبقے کو حوصلہ اور ہمت دینے والا قائد بنانا چاہتا تھا تا کہ لوگوں کو حق بات کہنے اور حق اور سچ کا ساتھ دینے کا حوصلہ ملے۔ وہ ملک میں رائج سیاسی آمریت اور فوجی جمہوریت کا مقابلے کرنے کیلئے ایک لیڈر کی تلاش میں تھا مگر اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی۔ اس سے قبل یہی جن چوہدری ظہور الٰہی، ایوب خان، مجیب الرحمٰن اور الطاف حسین پر ناکام تجربات کر چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ حاجی غلام علی جن کی حقیقت جان کر اسے مولانا فضل الرحمٰن کے حوالے کر دیتا تو جن کا حشر وہی ہوتا جو سترویں آئینی ترمیم کے بعد پاکستانی عوام کا ہوا ہے۔ جن نے حاجی غلام علی کی سوچ کا اندازہ کرتے ہوئے غلہ منڈی سے پروفیسر اللہ لوک کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ٹیوشن سنٹر پر آ گیا۔ خلیفہ جسے بیچ میں اور بے وقت بولنے کی عادت ہے نے قسور خان کے تسلسل کو توڑتے ہوئے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ پروفیسر غلہ منڈی سے آ رہا ہو اور جن نے اس کی اُنگلی پکڑ لی ہو۔ خود ہی سوچو ایک اجنبی پروفیسر کے ساتھ کیسے آ سکتا ہے۔ ویسے بھی آج کل ملک میں دہشت گردی کا پروگرام جاری ہے اور غیر ملکی دہشت گردوں کی ہر جگہ تلاش ہو رہی ہے۔ میرے حساب میں تو جن بھی غیر ملکی ہے اور اگر حاجی غلام علی کی ساتھ رہا ہے تو اس نے مولویانہ روپ ہی دھارا ہوگا ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا۔۔۔ قسور خان نے پوچھا۔۔۔ یار سمجھا کرو۔۔۔ خود ہی سوچو۔۔۔ حاجی غلام علی، اکرم درانی یا پھر مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ ایک کلین شیو خوبصورت لڑکا کیسے رہ سکتا ہے۔ جن اگر بابو بن کر حاجی صاحب کے ساتھ رہتا تو اس پر اکرم درانی اور مولانا کی نظر بھی پڑ سکتی تھی جو نہ صرف جن بلکہ مولانا اور درانی صاحب کیلئے بھی خطرے سے خالی نہ ہوتی۔ جن کا جمعیت کے ساتھ رہنا خود پارٹی اتحاد کے لئے بھی خطرہ تھا جبکہ مرکزی حکومت خاص کر شیر پاؤ اور شیخ رشید کو ایم ایم اے کے خلاف بولنے اور الزام تراشی کا موقع مل جاتا۔ تمہیں پتہ ہے کہ جونہی مرکزی حکومت ایم ایم اے کے خلاف کچھ کہتی ہے تو مولانا جنہیں شیخ رشید اور قائد لیگ کے اصحاب حکومت سیاست کا چھٹا بحری بیڑہ کہتے ہیں اپنے بیڑے کو الزام تراشی کے گرداب سے نکالنے کا ٹھیکہ قاضی صاحب کو دے دیتے ہیں چونکہ اس بیڑے کی کپتانی آج کل قاضی صاحب کے پاس ہے۔ مولانا کی سیاسی اٹھک بیٹھک سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ارتھ شاستر کا مطالعہ بھی کر رکھا ہے بلکہ سارے شاستر انہیں زبانی یاد ہیں جنہیں دھرانے کے لئے وہ کبھی کبھی بھارت دیش کی یاترا بھی کرتے ہیں۔ مولانا اگرچہ ہر مقام اور مرحلے پر یہ الفاظ ضرور دھراتے ہیں کہ ہم سیاسی اور جمہوری لوگ ہیں اور پارلیمانی جمہوری نظام کے محافظ بھی ہیں مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم اسلامی جمہوری، اخلاقی اور آفاقی نظام کے محافظ ہیں۔ مولانا شاطر سیاستدان اور گھبے ہوئے مولوی ہیں جو دنیا کی نعمتوں سے بھرپور لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد و منبر پر قبضہ قائم رکھنے کے ہنر وفن میں بھی یکتا ہیں۔ مولانا نے اپنی سیاست بازی سے چاروں گھی میں اور سر کڑاہی میں والے محاورے کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔ اب اگر اس محاورے کو مذہبی سیاسی فوائد کے حوالے سے بیان کیا جائے تو اس کی درست ادائیگی چاروں گھی میں، سر کڑاہی میں اور پاؤں ملائی میں بیان کرنے سے ہوگی۔ ایم ایم اے کی ساری قلفیاں اور جلیبیاں مولانا کے حصے میں ہیں۔ جس میں قائد لیگ سے قربت، شیر پاؤ سے محبت، بینظیر سے روابط اور پرویز مشرف کی عنائت شامل ہے جبکہ انتہا پسندی، سیاسی رقابت، دھرنے اور دھماکے جماعت اسلامی کے کھاتے میں ڈالے یا پھر ڈلوا دیئے جاتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ ایم ایم اے کی گھنٹھڑی قاضی صاحب کی قربانیوں سے بندی ہوئی ہے ورنہ مولانا پارٹی کب کی اسے گور گنٹھڑی بنا کر علیحدہ ہو چکی ہوتی۔ جہاں جمعیت کا فائدہ ہوتا ہے وہ شیر پاؤ اور قائد لیگ سے اتحاد کر لیتی ہے اور جماعت والوں کو نقصان پہنچانے سے ذرہ بھر دریغ نہیں کرتی جس کی زندہ مثال لقمان قاضی کی بلدیاتی انتخابات میں شکست اور حاجی غلامی علی کی جیت ہے۔ حاجی غلامی علی کی اسی جیت سے دلبرداشتہ ہو کر جن نے خاموشی سے علیحدگی اختیار کی اور غریب طالب علم کا بیس بدل کر پروفیسر اللہ لوک کے آستانے پر رہنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جتنا عرصہ جن طالب علم پروفیسر کے آستانے پر جسے وہ انگریزی میں ٹیوشن سنٹر کہتا ہے رہا ہے کافی لوگوں کے حق میں دعائیں قبول ہوتی رہیں اور پروفیسر اچھا خاصا پیر مشہور ہو گیا۔ جن کی موجودگی میں بھی پروفیسر دعاؤں کے معاملے میں چوزی رہا اور اکثر خوبصورت خواتین کو حیلے بہانوں سے بھگا دیتا۔ جو لڑکی یا لڑکا منت مراد کے چکر میں آتا پروفیسر اسے ٹیوشن پڑھنے کی دعوت دیتا اور پھر اسے کسی مشہور پیر کا پتہ بتا دیتا کہ وہاں چلے جاؤ وہ بہت ہی پہنچا ہوا پیر ہے تمہارا کام ہو جائے گا۔

میرے ہوتے ہوئے لکی مروت سے ایک بی اے پاس لڑکا پروفیسر کے پاس من کی مراد پانے آیا۔ وہ اپنے ساتھ سوا سیر مٹھائی، سوا گیارہ روپے اور سوا گز لٹھا بھی لایا تھا مگر پروفیسر نے اسے پلے سے پچاس روپے دے کر ڈیرہ بھیج دیا کہ وہاں جا کر پیر ڈاکٹر خالد رضا زکوڑی کا دیدار کرے اور اپنی مرادیں بیان کرے۔ لڑکا ایک ہفتے بعد واپس آ گیا چونکہ پیر صاحب اسلام آباد میں مشائخ کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے حکومتی ایوانوں کا چکر لگا رہے تھے اور سینٹ کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ لڑکے نے بتایا

کہ پیرزکوڑی کے پاس بارہ کروڑ نہیں کہ وہ سینٹ کی سیٹ خرید سکیں جبکہ وقار گلزار اور سلیم سیف اللہ کو ان پر برتری حاصل ہے۔اب جو پیر خود بہ مراد پھر رہا ہو وہ دوسروں کو کیا دے گا۔لڑکے کو پریشان دیکھ کر پروفیسر کے ایک طالب علم نے اسے مشورہ دیا کہ محترمہ کلثوم سیف اللہ کے پاس جا کر پیر خالد رضا زکوڑی اور عرفان اللہ مروت کے خلاف بیان دے۔اگر تمہارے بیان میں تھوڑا سا بھی وزن ہوا تو تمہیں علی قلی خان خٹک کی کسی نہ کسی فیکٹری میں نوکری مل جائے گی۔لڑکے نے ایسے ہی کیا اور اپوائیٹمنٹ لیٹر لے کر پروفیسر کے آستانے پر آیا اور پروفیسر کے طالب علم کو ایک موبائل فون اور اپنی دو تین گرل فرینڈز کے موبائل نمبر بطور نیاز پیش کر کے کام پر چلا گیا۔جاتے وقت وہ پروفیسر کے قریب سے گزرا مگر اسے سلام کرنے کے بجائے غصے سے بولا کہ تم سے تو تمہارا طالب علم اچھا ہے اگر پیری فقیری کا شوق ہے تو سیف اللہ خاندان کی بیعت کر لو جہاں سے مرادیں ملتی ہیں۔شکر ہے میں تمہاری نصیحتوں اور وظیفوں سے بچ گیا ورنہ میری مٹھائی اور لٹھا خواہ مخواہ ضائع ہو جاتے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ سارہ خان نامی ایک خوبصورت لڑکی نے عورتوں کے اجتماع میں با آواز بلند اعلان کیا کہ پروفیسر اللہ لوک فراڈ ہے۔میں دو بار مشکل سے اسے ملی اور من کی مراد تو درکنار میرے سارے بوائے فرینڈز مجھ سے دور ہو گئے۔وہ کہنے لگا ماں کی بات مانو اور کینڈا اپنے منگیتر کے پاس چلی جاؤ یا پھر اسے پاکستان بلا کر شادی کر لو۔میں نے پروفیسر کے کہنے پر چاروں قل چار روز تک پڑھے تو میرا کمینہ منگیتر خود ہی پاکستان آ گیا جس کے وجہ سے میں چار ہفتوں تک اپنے کسی دوست سے نہ مل سکی اور آخر کار نکاح کے بندھن میں باندھ کر وہ ظالم واپس کینڈا چلا گیا۔اب چار ماہ بعد میری رخصتی ہے۔یہ بھی کوئی بات ہوئی۔اب ایسے پیر کے پاس جانے کا کیا فائدہ۔میری عمر کوئی شادی کی ہے۔مشکل سے پچیس کی ہوئی ہوں ابھی عیش موج کے سات سال باقی تھے کہ سب چوپٹ ہو گیا۔اب میرا ایک بھی بوائے فرینڈ مجھے شاپنگ پر نہیں لے جاتا۔ہوٹلنگ کیئے تو کئی ہفتے گزر گئے ہیں۔نہ موج نہ مستی نہ ہلا نہ غلہ، بھلا میرڈ لائف بھی کوئی لائف ہوتی ہے۔پلیز بھول کر بھی پروفیسر اللہ لوک کے پاس نہ جانا ورنہ زندگی کے سارے لطف گنوا بیٹھو گی۔میں کم از کم دو سو لڑکیوں اور عورتوں کو جانتی ہوں جنہیں پروفیسر نے تباہ کیا ہے اور سب کی سب سوشل لائف سے کٹ گئی ہیں۔جسے پوچھو وہ نماز پڑھ رہی ہے۔تلاوت میں مصروف ہے یا پھر پروفیسر کے بتلائے ہوئے وظائف لیکر بیٹھی ہے۔اسلام آباد میں رہنے والی میری دو انتہائی ماڈرن سہیلیوں کے خاوندوں نے اس انتہا پسندی پر اعتراض کیا تو انہوں نے بڑے پیار سے اپنے سرتاجوں سے گزارش کی کہ اگر آپ نماز روزے اور تلاوت کو نہیں اپناتے تو نہ اپنائیں ہم آپ کی خادمائیں ہیں اور زندگی بھر نمازوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ آپ کی خدمت کریں گی۔آپ چاہیں تو ماڈرن بیویاں لے آئیں دوسری شادیاں کر لیں ہم ان کی بھی خدمت کریں گی۔

پروفیسر کی ورغلائی ہوئی دو عورتوں کے تو گھر ہی بدل گئے ہیں۔ان کے بچے سکول کے بعد قرآن پڑھتے ہیں اور خاوند پنجگانہ نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔میری ایک دوست نے اپنا زیور بیچ کر محلے کی پانچ غریب لڑکیوں کی شادیاں کروائی ہیں اور دوسری سارا خاندان لیکر عمرے پر چلی گئی ہے۔سارہ خان نے عورتوں کو تلقین کی کہ پروفیسر سے دور رہا جائے چونکہ وہاں سے کوئی مراد نہیں ملتی بلکہ سوشل لائف کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔پروفیسر سے حاجی غلامی علی، اکرم درانی اور مولانا فضل الرحمٰن لاکھ درجے بہتر اور حد سے زیادہ پہنچے ہوئے ہیں۔اسی محفل میں موجود ایک لڑکی جس کا تعلق ہزارہ سے ہے نے سردار ادریس کے متعلق انکشاف کیا کہ وہ بھی پہنچے ہوئے ہیں۔اس نے بتایا کہ سردار صاحب کے زیر عتاب محکمہ جات میں ملازم ہری پور کی ایک لڑکی نے سردار صاحب کے متعلق بدگمانی کی تو ایک ماہ میں اس کی پوسٹنگ چھ مختلف اضلاع میں ہوئی ہے۔حال ہی میں اس لڑکی کی ملاقات ایک کلرک سے ہوئی ہے جو سرکاری ملازمین کی ترقیوں اور تبدیلیوں کے بارے میں پیش گوئیاں کرتا ہے۔اس کلرک بابے نے دختر ہری پور کو بتایا ہے کہ فوراً سردار صاحب سے ٹائم لیکر ان سے تعویز لو ورنہ اگلی پوسٹنگ ڈیرہ اسماعیل خان بھی ہو سکتی ہے جہاں بڑے مولانا اکثر موجود رہتے ہیں۔اب لڑکی سوچ رہی ہے کہ ڈیرہ چلی جائے یا ایبٹ آباد۔سنا ہے اس نے ڈاکٹر شاہینہ جمیل سے بھی مشورہ کیا ہے اور مولانا کے سیاسی اور سردار ادریس کے جمہوری وزن کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی ہیں تاکہ کم سے کم بوجھ برداشت کر کے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔

غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق چاروں صوبائی اور مرکزی سیکرٹریٹ اسلام آباد میں بہت سے کلرک، سپرٹنڈنٹ اور سیکشن آفیسر ترقیوں، تبادلوں، بیرونی دوروں، نئی تقرریوں سے لیکر نیب کے چھاپوں اور سیاسی لیڈروں اور پارٹیوں کے درمیان ہونے والی خفیہ ملاقاتوں کی نہ صرف پیشن گوئیاں کرتے ہیں بلکہ ان ملاقاتوں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے رازوں کی حقیقت بھی جانتے ہیں۔یہ سب ہستیاں بھی پہنچی ہوئی ہیں اور ان سے سیکرٹری اور وزیر بھی ڈرتے ہیں۔ان پہنچی ہوئی ہستیوں میں کچھ دانشور، تجزیہ نگار اور کالم نگار بھی شامل ہیں اور ان دانشور اور تجزیہ نگار ہستیوں کا رابطہ تقریباً سبھی سرکاری اداروں سے رہتا ہے۔روزنامہ جنگ سے وابستہ رحمت علی رازی اور مقتدر اعلیٰ کے در پر ہمیشہ دست بستہ کھڑے نذیر ناجی کا تعلق بھی ایسی ہی ہستیوں سے ہے جن کا ہر کالم تبادلوں تقرریوں اور تبدیلیوں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

دختر ہری پور کو کلرک بابے نے کچھ اندر کی باتیں بھی بتائیں ہیں اور پہنچی ہوئی ہستیوں سے ملنے کے طور اطوار بھی سکھلائے ہیں۔ان ہستیوں سے ٹائم لیکر ملنا ضروری ہے ورنہ بہ ٹیچے سائلوں کو اکثر نامراد لوٹنا پڑتا ہے۔ویسے تو صوبہ سرحد کے وزرائے کرام بلا روک ٹوک ہر سائل سے مل لیتے ہیں اور دعائیں دے کر رخصت کر دیتے

ہیں۔اکثر سائل وزیروں کے دفتروں سے نمناک آنکھیں لیکر نکلتے ہیں چونکہ وزیرانہیں اپنی بے بسی اور مرکزی حکومت کی بے انصافیوں اور چیرہ دستیوں کی ایسی ایسی کہانیاں سناتے ہیں کہ سائل کا دل بھرآ تا ہےاور وہ بطورصدقہ اپنی جیب سے وزیر کو کچھ دے کرہی جاتا ہے۔شبنم اوراس کی بہن شمع کے مطابق ایم ایم اے کے وزیروں کی یہ مظلومانہ چال بہت کامیاب جارہی ہے۔پچھلی بار ایم ایم اے نے کتاب اور افغان جہاد کے نام پر کامیابی حاصل کی تھی اوراس بار وہ مظلومیت اور مرکزی حکومت کی استحصالی پالیسی کوکیش کروائیگے۔اگر جنرل مشرف اورشوکت عزیز واقعی ایم ایم اے کوانتخابات میں شکست دینا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ صوبہ سرحد کےعوام پرتوجہ دیں اور سندھ کے گورنر کی طرح سرحد کے گورنر کوبھی مالی اختیار دے کرعوامی مسائل کوفوراً حل کریں تاکہ لوگ وزیروں کومسکین اورفقیرسمجھ کران پرترس نہ کھائیں اوراپنے سوا گیارہ روپے،سوا سیر مٹھائی، سوا گزلٹھااورکالی مرغی بچالیں۔ایم ایم اے سرحد کے وزرائے کرام اپنے دفتروں میں بیٹھ کرخاموشی سے اپنی آئندہ الیکشن مہم چلارہے ہیں اور ساتھ ساتھ سوا گیارہ روپے فی سائل کے حساب سے نیاز اورصدقے کی صورت میں فنڈ بھی جمع کررہے ہیں۔آپ اسے مولویانہ چال کہیں یا چانکیا نیتی مگرحقیقت یہ ہے کی ایم ایم اے فضل الرحمٰن گروپ والے جنرل مشرف سے سترویں ترمیم کا پوراپورامعاوضہ وصول کررہے ہیں۔اگرآپ کویقین نہ آئے توتخلیے میں اکرم درانی صاحب سے پوچھ لیں یا پھران کی دلبرانہ مسکراہٹ سے اندازہ کرلیں کہ ان کے اندر کتنے لڈو پھوٹ رہے ہیں۔

یار یہ شبنم،شمع،سارہ،سیما اور پتہ نہیں تم کن کن کا نام لے رہے ہو یہ سب عورتوں کے کس اجتماع میں شریک تھیں؟ خلیفہ نے قسور خان سے پوچھا۔دیکھوخلیفہ یہ روشن خیالی کا زمانہ ہےاورامریکہ ہمیں ایک غیرایٹمی،غیرمسلح مگرروشن خیال اوراعتدال پسندقوم بنانا چاہتا ہے۔فرانس والوں نے مختاراں مائی پرایک کتاب لکھی ہے جبکہ بھارت اورامریکہ اس پرفلمیں بنارہے ہیں۔اب سننے میں آرہا ہے کہ وہ دنیا کی سوبڑی شخصیات میں بھی شمار ہورہی ہے جبکہ گنیز بک آف ورڈ ریکارڈ میں ایک صفحہ اس کے نام ہورہا ہے۔دنیا کا کوئی ایسا اخبار یارسالہ نہیں جہاں اہل مغرب نے مختاراں مائی آف پاکستان کا ذکر نہ کیا ہو۔مختاراں مائی ایک عورت نہیں بلکہ ایک ادارہ بن گئی ہے۔اس کی سیکرٹری فرفرانگریزی بولتی ہےاوراس کے جدید ڈیری فارم کی سوا تین سوبھینسیں دودھ کی نہریں بہارہی ہیں۔مختاراں مائی کیلئے دنیا بھرمیں ترجمان مقررکردیئے گئے ہیں۔مختاراں مائی کو پاکستان ہی سے تو ڈھونڈ نکالا گیا ہے ورنہ بھارت میں روزانہ ایسے درجنوں واقعات ہوتے ہیں۔اب اسے پاکستان،اسلام اورمسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔ امریکہ،برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں گینگ ریپ کے ہزاروں واقعات روزانہ ہوتے ہیں اور چھ سات بوائے فرینڈ رکھنے والی لڑکیاں اورخواتین ہمارے ہاں اب عام ہیں۔سیکس ورکرز ہمارے پرائیویٹ ٹی وی چینلوں پرکھلے عام انٹریو دے رہی ہیں اوراپنے پیشے کے فوائد بیان کرتی ہیں مگر نہ امریکہ پریشان ہے اور نہ ہی ہمارے وزیر تعلیم اورانسانی حقوق کی تنظیمیں۔بالائی طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین میں یہ ایک فیشن ہےاور نچلے طبقے میں مجبوری بھی ہے اور روزگار بھی۔بحثیت مجموعی دیکھوتو کام کی نوعیت وہی ہے جس کا واویلہ مختاراں مائی کررہی ہے۔اب جوفلمیں امریکہ اور بھارت بنارہے ہیں ان کی مارکیٹ بھی توہمارا ہی ملک بنے گا اور دھڑادھڑ مختاراں مائیاں بنتی جائینگی مگراس پرشورنہیں ہوگا۔اب تو مختاراں مائی کے نام سے ایک تنظیم بھی بن رہی ہے جس کی ملک بھرکی مختاراں مائیاں ممبر ہونگی۔جس طرح مسلم لیگ کے علماءٔ ومشائخ کا ایک ونگ ہے اسی طرح ہر پارٹی اپنی اپنی مختاراں مائی تنظیم بھی بنائے گی ظاہر ہے یہ سب تنظیمیں خواتین سے متعلق ہیں اور ہونگی اوران میں خواتین کی شرکت بھی ضروری ہوگی۔پچھلے دنوں مسلم لیگ بیوٹیشن اینڈ برائیڈل ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ اسلام آباد میں ملک بھرسے بیوٹیشن اینڈ برائیڈز تشریف لائیں اوراس اجلاس اورشوکا مقصد بھی روشن خیالی کی روشنی گھرگھر پہنچانا ہے تاکہ مختاراں مائی کا غل غپاڑہ کم ہواور بوائے فرینڈ زایسوسی ایشن کے ممبران میں اضافہ ہو۔حکومت وقت اورصاحبان اقتدار پیشےاور پرابلم کا نام بدلنا چاہتے ہیں کام کی نوعیت سے انہیں غرض نہیں۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہمارے ہاں بہبودآبادی کی الگ اورخواتین کی الگ وزارت ہے حالانکہ بہبودآبادی کا تعلق عورت سے ہے اگرعورتوں کے مسائل حل کردیے جائیں تو بہبودآبادی کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا۔مگرحکومت ایسے کاموں میں الجھنے سے پرہیز کرتی ہے۔۔۔پرہیز کیوں کرتی ہے۔۔۔یہ کوئی برڈفلو یا پھرخدانخواستہ ایڈز کا مرض ہے؟ خلیفہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔نہیں خلیفہ ایسی بات نہیں حکومت محکمے کم نہیں کرنا چاہتی بلکہ بڑھانا چاہتی ہے۔ اب تم نے بات کی ہے تو شائدکل کلاں برڈفلواورایڈز کا الگ محکمہ بھی بن جائے۔ ہمارے ہاں قومی اسمبلی کے۳۴۲ اورسینٹ کے سو اراکین ہیں اوراگرحکومت کوکبھی ۲/۳ کی تعداد پوری کرکے اسمبلی سے کوئی بڑا بل پاس کروانا پڑجائے تواسے کم ازکم تین سووزیروں کی ضرورت ہوگی جبکہ اس کام کیلئے موجودہ وزارتیں کم ہیں۔پھرامریکیوں کا مطالبہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں روشن خیالی، اعتدال پسندی، انسانی حقوق،عورتوں کے حقوق، امریکیوں کے مفادات، دین سے پرہیز، دنیا سے لگاؤ،فیشن ڈیزائنگ، بوائے فرینڈز پروموشن،سوشلائیزیشن وغیرہ کی الگ الگ وزارتیں ہونی چاہیے تاکہ لوگ فرسودہ خیالی سے چھٹکارہ پاسکیں۔

امریکہ میں جن پاکستانی خواتین کوحکومتی سطح پرپسند کیا جاتا ہےان میں سرفہرست محترمہ مختاراں مائی، زبیدہ جلال، ماروی میمن، نیلوفربختیاراورکشمالہ طارق ہیں۔ مختاراں مائی کے علاوہ دیگرخواتین کاتعلق حکومتی اور وزارتی فوج سے ہےاورحکومتی پارٹی کوان خواتین کی کارکردگی پرفخر ہے۔خلیفہ بھائی اگرتم مجھ سے یہ سوال کرنے کا سوچ رہے ہوکہ ان کی کارکردگی کیا ہے تو میں اسے تمہارا نہیں بلکہ ساری قوم کا سوال تصورکرونگا چونکہ آج تک کسی کوبھی ان خواتین بلکہ مردوں کی کارکردگی کا بھی علم نہیں۔سوائے اس

کے کہ انہیں جنرل مشرف، جارج بش اور کنڈو لیزا رائیس پسند کرتی ہیں۔ اب تم پوچھو گے کہ پاکستان اور امریکہ کی اعلیٰ ترین ہستیوں نے ان خواتین کا چناؤ کیوں کیا ہے؟ حالانکہ ہمارے ملک میں خوبصورت اور ذہین خواتین کی کمی نہیں۔۔۔تو بھائی اس کا صرف یہی جواب ہے کہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔۔۔ جہاں تک مختاراں مائی کا تعلق ہے تو اگلے صاف شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخابات میں اسے سینٹ یا پھر قومی اسمبلی میں سیٹ ملنے کا بھی چانس بن رہا ہے۔ جس طرح فرانسیسی اور امریکی مختاراں کو شیپ اپ کر رہے ہیں ہوسکتا ہے اسے کوئی وزارت بھی مل جائے۔ اگر انتخابات سے پہلے ایم ایم اے ٹوٹ گئی تو ظاہر ہے جمعیتِ فضل الرحمٰن اور قائد لیگ کا اتحاد جو کہ کئی زاویوں سے فطری ہے یقینی ہو جائے گا اور مختاراں مائی اور شاہینہ جمیل جمعیت اور لیگ کیلئے خوش بختی کی علامت ثابت ہونگی جبکہ ان دونوں خواتین کے سیاسی میدان میں اترنے سے نیلوفر بختیار، ماروی میمن، زبیدہ جلال اور کشمالا طارق کا سیاسی مستقبل تاریک ہوسکتا ہے اور مردانہ وزارتوں کی تقسیم میں امیر مقام، سلیم سیف اللہ اور سردار ادریس وغیرہ کا وزارتی پتا پیلا ہونے کا بھی خطرہ ہے۔

اب تم پھر پوچھو گے کہ بات شمع، سارہ، شبنم، رانی اور سیما کی ہو رہی تھی اور میں نے تمہیں ڈی ٹریک کرنے کے لئے سیاسی سٹوری سنا دی ہے تو بھیا! یہ چاروں خواتین بھی اندر واندر سیاست میں آ چکی ہیں اور ان کا فین کلب جارج بش اور پرویز مشرف تک محدود نہیں۔ یہ چاروں بیک وقت بڑے بڑے سمگلروں، پیروں فقیروں، گدی نشینوں، تاجروں، ججوں، صنعت کاروں، ہوٹل مالکان، پولیس افسروں، سیاستدانوں، صحافیوں اور دانشوروں سے لیکر رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیوروں کی نبض تک جانتی ہیں اور انہیں پتہ ہے کہ کس کا بلڈ پریشر کب اور کیسے ہائی کرنا ہے۔ اب شبنم ہی کو دیکھو کوئی کام کاج نہیں، تعلیم واجبی ہے، عمر بھی اتنی بانکی نہیں کہ بندہ مر مٹے، گھر کا کوئی فرد روزگار سے منسلک نہیں مگر اپر کلاس زندگی بسر کر رہی ہے۔ سالم ٹیکسی بک کروا کر شہر جاتی ہے۔ ہر ہفتے سات رنگوں کے سات سوٹ سلواتی ہے۔ امپورٹڈ خوشبو لگاتی ہے اور انگریزی کے الفاظ مکس کر کے اردو بولتی ہے۔۔۔ شمع، رانی، سارا اور سیما سمیت درجنوں لڑکیاں اس کی شاگردی میں ہیں جبکہ شبنم کا دعویٰ ہے کہ پروفیسر اللہ لوک اس کے دل میں رہتا ہے۔

واقعی! خلیفہ نے پوچھا؟ بلکل سچ ہے میرے سامنے اس نے فون پر کسی کو بتایا کہ تم جس پروفیسر کے در پر دھکے کھا رہے ہو وہ میرے دل میں رہتا ہے۔ مگر خلیفہ جانی یہ یکطرفہ افیئر ہے۔ شبنم پروفیسر کے دل میں نہیں رہتی چونکہ پروفیسر پہلے ہی دل کا مریض ہے اور پروفیسر کی ہر ہر حرکت پر ایک جن تین مرد اور تین عورتیں نظر رکھے ہوئے ہیں اور پروفیسر کی کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ جونہی وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تر کیے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جن بھی کبھی کبھار لاہور سے آ جاتا ہے ورنہ زیادہ وقت لاہور میں چوہدری ظہور الٰہی روڈ پر گزارتا ہے اور چوہدری برادران کی چالبازیوں پر مقالہ لکھ رہا ہے۔ پچھلے دنوں جن کسی کو موبائل پر بتا رہا تھا کہ چوہدریوں کا خیال ہے کہ ان کے بغیر پرویز مشرف نہیں چل سکتا اور پرویز مشرف کو شک ہے کہ چوہدری اس کی وجہ سے چوہدراہٹ کر رہے ہیں جبکہ اندر کی بات کچھ اور ہے جس کا ذکر ابھی مناسب نہیں۔ شبنم جن خواتین کی تربیت کر رہی ہے وہ آنے والے دنوں میں ملک کی روشن خیال، اعتدال پسند اور بیباک سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والی ہیں۔ یہ خواتین آج کل بیوٹیشن اینڈ برائیڈل شوز کے علاوہ بہت سی غیر اعلانیہ سیاسی سماجی اور صحافتی تقریبات کو رونق بخش رہی ہیں اور دن بدن اپنا نوٹ اور ووٹ بینک بڑھا رہی ہیں۔ شمع کا بیان ہے کہ اس کے گروپ کا تعلق عام اور نچلے طبقے سے ہے مگر وہ طبقاتی سوچ پر یقین نہیں رکھتی اور ہر طبقہ خیال کی خدمت کرنا اپنے لئے اعزاز سمجھتی ہے۔ سیما کے مطابق اگر کل کلاں وہ یا اس کی کوئی کولیگ کوئی اعلیٰ سیاسی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو وہ عوام کا فیس لفٹ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑینگی۔ رانی چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور عالمی سطح پر ملک کا نام روشن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو مہناز رفیع، بشریٰ رحمٰن، کلثوم سیف اللہ اور خورشید افغان کا متبادل سمجھتی ہے۔ شبنم کی طرح خورشید افغان کا روحانی تعلق پیر صاحب پگاڑا سے ہے۔ جس طرح پروفیسر اللہ لوک شبنم کے دل میں رہتے ہیں ویسے ہی خورشید افغان پیر صاحب کے دل میں رہتی ہے اور انہیں کے آستانے پر پرورش پا کر اسمبلی تک پہنچی ہے۔ مہناز رفیع کے گرو ائیر مارشل اصغر خان ہیں جبکہ بشریٰ رحمٰن اور کلثوم سیف اللہ خود علمِ سیاست کی یونیورسٹیاں ہیں جہاں گرو اور چیلے دونوں ہی شاگردی میں رہتے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے حال ہی میں تلک لگا کر اور بھگوان کی دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جنرل مشرف کی طویل زندگی اور اقتدار کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کی ہے۔ اب پتہ نہیں بھگوان ایشور بشریٰ دیوی کی پرارتھنا کو سویکار کرتے ہیں یا نہیں مگر اس پرارتھنا کا شوکت عزیز اور چوہدری شجاعت پر کوئی اثر نہیں ہوا ورنہ کیبنٹ ری شفل میں انہیں عورتوں کی وزارت ضرور مل جاتی۔

شبنم اور خورشید افغان میں صرف روحانی مماثلت ہی ہے جبکہ بہت سے دیگر امور میں خورشید کو شبنم پر برتری حاصل ہے۔ خورشید کا مرشد امیر کبیر اور جاگیردار ہے جبکہ شبنم نے غریب درویش کو دل میں بسا رکھا ہے۔ خورشید کو اپنے پیر پر جسمانی برتری حاصل ہے جبکہ پروفیسر اللہ لوک خورشید کے ہم وزن ہیں۔ خورشید کا سکھر میں افغان ہوٹل ہے جہاں غریبوں کو سستی روٹی اور چائے کے ساتھ پشتو موسیقی سننے کو ملتی ہے جبکہ شبنم کو دیکھ کر بہت سے غریبوں کی بھوک ہی مٹ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تھوڑی بہت اونچ نیچ کے بعد شبنم خورشید کا بہترین نعم البدل ہے بشرطیکہ پیر صاحب پگاڑا سے شبنم کا تعارف کروایا جائے اور پروفیسر اللہ لوک جیلس نہ ہوں۔

خورشید اور شبنم اس بات پر بھی یقین رکھتی ہیں کہ جوانی میں اپنے خاندان کی بہتری کیلئے ذاتی قربانی دینا کوئی گناہ نہیں جبکہ دونوں کی پسندیدہ شخصیات ڈاکٹر مہدی

حسن، ڈاکٹر جاوید غامدی، ڈاکٹر مبارک علی، پیر پگاڑا، ڈاکٹر رفعت حسین، اکرم درانی، مولانا فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر شاہینہ جمیل ہیں۔شبنم اور خورشید دنیا کی دو ہی خواتین ہیں جنہیں عمران خان، جنرل مشرف، شیخ رشید، بل کلنٹن، امیتابھ بچن، پرنس چارلس اور نواز شریف پسند نہیں یا پھر دونوں ان کی فین نہیں۔

جی بیٹا آپ نے کیا پوچھا؟ پروفیسر اللہ لوک نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔۔۔سر میں نے پوچھا تھا کہ صائمہ کون ہے؟ پروفیسر اللہ لوک کے سوال پر میں چونکا اور اپنی موجودگی کا احساس ہوا کہ میں کباڑی بازار میں خلیفہ اور قسور کی باتیں نہیں سن رہا بلکہ خلیفہ کے ساتھ پروفیسر اللہ لوک کے سامنے بیٹھا ہوں۔

بیٹا جی یہ صائمہ یونیورسٹی کی طالبہ ہے اور پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہے۔اپنے ریسرچ پیپر کی تیاری میں لگی ہے اور کبھی کبھی یہاں آ کر تھوڑی اصلاح لیتی ہے۔۔۔

کیوں؟ آپ صائمہ بی بی کو جانتے ہیں۔۔۔نہیں سر میں خود تو نہیں جانتا البتہ میرے دوست قسور خان نے ذکر کیا تھا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں صائمہ خان نامی طالبہ ہے جو مختلف امور کی ماہر سمجھی جاتی ہے۔اس سے پہلے کہ خلیفہ صائمہ کی جھوٹی تعریفیں کر کے پروفیسر اللہ لوک سے قہوے کا ایک اور گلاس بنوا کر پیتا میں نے اجازت کیلئے درخواست کر دی۔ مجھے پتہ تھا کہ خلیفہ صائمہ نامی کسی لڑکی کو نہیں جانتا چونکہ قسور خان نے بھی صائمہ کا ایک ہی بار ذکر کیا تھا کہ وہ جن کی طرح یا پھر جن صائمہ کی طرح کھوجی ہے۔میں نے پروفیسر اللہ لوک سے اجازت لیکر خلیفہ کی جھوٹی کہانی کے پلاٹ پر پانی پھیر دیا اور اپنی درخواست بھی پیش نہ کر سکا۔۔۔۔

(۲)

خلیفہ میرا دوست نہیں اور نہ ہی کوئی خاص جان پہچان ہے۔ بس کسی کی وساطت سے ملاقات ہوئی اور اسی ملاقات کے دوران خلیفہ اور اس کے دوست قسور خان کی گفتگو سے پتہ چلا ہے کہ یہاں کوئی پروفیسر اللہ لوک بھی ہوتے ہیں جنہیں خلیفہ اور قسور کے علاوہ بہت سے لوگ جانتے ہیں اور ہر ایک کی پروفیسر صاحب کے بارے میں الگ رائے ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پروفیسر اللہ لوک ولی اللہ ہیں۔ کچھ انہیں روائتی پیر کہتے ہیں اور کچھ محض انگریزی کا استاد اور صحافی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جنہیں پروفیسر اللہ لوک پسند کرتے ہیں وہ پروفیسر کو ناپسند کرتے ہیں اور جنہیں پروفیسر ناپسند کرتے ہیں وہ پروفیسر کو دل میں بسائے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو شکایت ہے کہ پروفیسر نذر نیاز نہیں لیتا اور نیاز کے بغیر فقیر کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ بہر حال ہر طبقے کا اپنا اپنا خیال ہے مگر پروفیسر کو کسی کی پروہ نہیں۔

خلیفہ نے پروفیسر اللہ لوک سے پہلی ملاقات کے بعد بتایا کہ آئندہ اگر آنا ہو تو فون کر کے پروفیسر سے وقت لے لینا اور جب تک پروفیسر خود نہ پوچھے اپنے مسائل کے متعلق بات نہ کرنا۔ اگر پروفیسر کے دیئے ہوئے وقت پر نہ پہنچ سکو تو بھی کوئی بات نہیں تم دو تین گھنٹے لیٹ جا کر جھوٹ بول دینا کہ کسی وجہ سے مصروف ہو گیا تھا۔ خلیفہ نے بتایا کہ پروفیسر کے ساتھ اس کا رشتہ جھوٹ پر مبنی ہے مگر پروفیسر کو میرے جھوٹ کا پتہ نہیں اگر پتہ ہے بھی تو وہ درگزر کرتا ہے۔ دراصل درگزر کرنا پروفیسر کی عادت ہے اور جھوٹ میری خصلت ہے۔۔۔ہاں۔۔۔اگر تم پروفیسر کے ساتھ سچ بولو اور وقت پر جاؤ تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ نہ ہی تمہاری ابن الوقتی پر خوش ہوگا اور نہ ہی بے وقتی اور جھوٹ پر ناراض۔۔۔یونو ہی از ویری کول اینڈ کمپوزڈ پرسن۔

خلیفہ کی باتوں نے مجھے پروفیسر اللہ لوک کے بارے میں خاصا بدگمان کر دیا مگر پھر بھی میں نے ہمت کر کے فون پر وقت لے لیا۔ فون پر ہی پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو وقت لینے کی ضرورت نہیں آپ جب جی چاہئے آجایا کریں۔ میں صبح نو بجے سے رات نو بجے تک اپنے ٹیوشن سنٹر میں ہوتا ہوں۔ دو بجے بعد از نماز ظہر کلاس لیتا ہوں اور یہ سلسلہ نماز مغرب تک جاری رہتا ہے۔ آپ کلاس سے پہلے یا بعد جب جی چاہئے آسکتے ہیں۔

میں وقت پر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا اور پروفیسر اللہ لوک نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ پروفیسر اللہ لوک ذکر میں مصروف تھے جس کی وجہ سے دس منٹ تک خاموشی رہی۔ ذکر کے بعد پروفیسر اللہ لوک نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو ساتھ بیٹھی ان کی اسسٹنٹ ہنی بیگم نے بھی ہاتھ اٹھا لئے اور میں بھی اس دعا میں شامل ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے مسائل کا نام لیکر دعا مانگنے لگا۔ ابھی دعا ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک لڑکی ہاتھ میں تین کتابیں اور ایک رجسٹر لیے کمرے میں داخل ہوئی اور میرے دائیں جانب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر اللہ لوک نے آہستہ سے پوچھا صائمہ بی بی آپ کیسی ہیں۔ صائمہ نے جواب دیئے بغیر سر کو ہلکی جنبش دی اور منہ سے کچھ بولے بغیر ہی پروفیسر کی بات کا جواب دے دیا۔

پروفیسر اللہ لوک نے میری، صائمہ اور اپنی اسسٹنٹ ہنی بیگم کی موجودگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آنکھیں بند کئیں اور ایک بار پھر ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ ہنی بیگم چونکہ پروفیسر کی عادات سے واقف ہے اس لئے اس پر پروفیسر کی خاموشی کا زیادہ اثر نہ ہوا اور وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اگر صائمہ موجود نہ ہوتی تو شائد میں بھی اجازت لیکر چلا آتا مگر صائمہ کی موجودگی نے پروفیسر اللہ لوک کے اس برآمدہ نما کمرے کا ماحول ہی بدل دیا۔ یوں تو صائمہ ایک عام سی لڑکی دکھائی دی جس نے سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور خلاف توقع سر پر چادر نما دوپٹہ بھی اوڑھ رکھا تھا۔ میک اپ بھی اتنا گہرا نہ تھا مگر اس کی موجودگی کی وجہ سے برآمدے میں ایک خاص خوشبو کا احساس ہونے لگا۔ میں خوشبوؤں کے ناموں اور مہک کے اثرات سے تو واقف نہیں ہوں مگر صائمہ کی آمد سے جس خوشبو نے پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے کو معطر کیا یہ خوشبو سارہ خان، نرگس، نگہت، نیلوفر، یاسمین، روبینہ، راشدہ، شبنم، شمع، سیما اور رانی کی آمد پر کبھی نہ آئی۔ سارہ خان سے رانی تک جتنی خواتین کو میں نے پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے کی سیڑیاں چڑھتے یا اترتے دیکھا اور ان کے قریب سے گزرا۔ ان کے جسموں سے الگ الگ قسم کے عطریات کی خوشبوئیں تو آرہی تھیں مگر ساتھ ہی ان کی سانسوں کی بدبو نے ماحول پر نحوست طاری کر رکھی تھی جیسے کسی کھلے مین ہول کو عطر میں بھگوئے ہوئے پتلی ململ کے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔

حقیقت کیا تھی اس کا تو مجھے پتہ نہیں مگر ایک لمحے کیلئے میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر اللہ لوک صائمہ کی آمد سے آنے والی خوشبو کی مہک میں ڈوب گئے ہیں۔ پروفیسر اللہ لوک کو مراقبے کی حالت میں دیکھتے ہوئے میرے نفس نے مجھے ابھارا اور تحریک دی کہ گردن گھما کر صائمہ کو دیکھوں مگر نفس کی فل سپورٹ کے باوجود میں ایسا نہ

کر سکا اور بڑی کوشش کے بعد اس کے ہاتھ ہی دیکھ سکا جن پر مہندی سے تازہ پھول اور بوٹے رنگے ہوئے تھے۔ میں نے غور سے ان پھولوں کو دیکھا تو مہندی سے رنگے ہاتھوں میں تین کتابوں کی جگہ سات رنگوں کا گلدستہ آ گیا اور کلائیوں پر بنے پھول ایک وسیع وعریض باغ میں تبدیل ہونے لگے۔ ابھی میں اس تبدیلی پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ میرا سر ٹیبل سے ٹکراتا میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور سر کو جھٹک کر غنودگی کے غلبے سے نکلنے کی کوشش کی کہ یکا یک خوشبو کی مہک میں نہ صرف اضافہ ہو گیا بلکہ اس میں یخ بستہ ہوا بھی شامل ہو گئی۔ خوشبو کی طرح ہوا بھی عجیب تھی۔ نہ تو یہ گلیشئر کی تندی بادتھی اور نہ ہی خنجراب اور چمن میں سیٹیاں بجاتی قندہاری اور کاشغری ہواؤں سے مماثلت رکھتی تھی۔ اس ہوا کا طوفانی اور طغیانی مزاج نہ تھا بلکہ یہ ایک ٹھنڈا، خوشبودار اور لطیف احساس تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ خوشبو کی مہک کارگل کے شہیدوں کے خون سے آنے والی خوشبو سے ملتی جلتی تھی مگر اس خوشبو سے ہمارے حکمران، اعلیٰ اشرافیہ اور دانشور واقف نہیں اس لئے اس کی مثال پیش کرنا مناسب نہیں۔ ٹھنڈک اور خوشبو میں ڈوبتے ماحول کی پراسراریت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا تو میں نے ہمت کر کے پہلے پروفیسر صاحب کو دیکھا تو پروفیسر اللہ لوک ہنوز مراقبے کی حالت میں تھے اور ماتھے پر پسینہ تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ پروفیسر پر ٹھنڈک کا اثر نہیں۔ اب کی بار میں نے تقریباً کرسی سے اٹھتے ہوئے اپنا رخ بدلا تو صائمہ کرسی سے غائب تھی مگر اس کے دونوں ہاتھ، سات رنگوں کا گلدستہ اور تین کتابیں کرسی پر رکھے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس پراسرار ماحول سے اٹھ کر بھاگ جاتا پروفیسر اللہ لوک نے تین بار اللہ اکبر کہا اور ایک بار پھر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ پروفیسر نے جونہی اللہ اکبر کہا ماحول میں پھر تبدیلی آ گئی۔ خوشبو کی مہک اور ٹھنڈک کا احساس بھی بدل گیا۔ برآمدہ میدان میں تبدیل ہو گیا اور پروفیسر کے ٹیوشن سنٹر کے اردگرد کی عمارتیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر اللہ لوک کرسی کے بجائے ایک چٹان پر بیٹھے ہیں اور ہزاروں مرد و خواتین ان کے سامنے دائیں اور بائیں کھڑے ہیں۔ شبنم، شمع، سارہ، سیما، رانی اور ان کی ہم خیال خواتین بوسیدہ اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہیں اور ان کے جسموں پر جگہ جگہ غلاظت لگی ہے۔ ان خواتین کے پیچھے قطاروں میں بہت سے مرد کھڑے ہیں جن کی حالت بھی اچھی نہیں جبکہ بہت سے مرد اور خواتین انتہائی قیمتی اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہیں۔ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو احرام باندھے ہوئے ہے اور سارا جلسہ ہاتھ اٹھائے دعا میں مشغول ہے۔ پروفیسر اللہ لوک کے پیچھے تین مرد اور تین خواتین نقاب پہنے کھڑے ہیں اور پروفیسر صاحب جن جن لوگوں کے نام لیکر دعائیں مانگ رہے ہیں ان میں سے کسی کسی نام کے پکارے جانے پر یہ گروہ آمین کہتا ہے جبکہ باقی مجمع خاموش ہے اور صرف ہاتھ اٹھائے پروفیسر کی جانب متوجہ ہے۔

پروفیسر اللہ لوک جس میدان میں لوگوں کے نام لے لے کر دعائیں مانگ رہے ہیں اس کے خدوخال دوسائی کے میدانوں سے ملتے جلتے ہیں مگر یہ دوسائی نہیں۔ پروفیسر صاحب جس چٹان پر بیٹھے دعا میں مشغول ہیں ان کے پیچھے تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک بڑی چٹان پر پروفیسر کا ہم شکل ایک اور آدمی بھی دعا میں شامل ہے مگر وہ کسی کا نام نہیں لے رہا۔ جب پروفیسر کے پیچھے کھڑے چھ نقاب پوش آمین کہتے ہیں تو پروفیسر کا ہم شکل اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتا اور پھر دعا کی حالت میں آ جاتا ہے۔ میں اس جلسے میں گندے جسموں والی خواتین اور ان کے پہلو میں کھڑے مردوں کے علاوہ کسی ایسے فرد کی تلاش میں ہوں جو میرا مسئلہ بھی پروفیسر کو بتائے تا کہ وہ میرا نام لیکر دعا کرے مگر دیر تک مجھے اس جگہ کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آتا۔ صائمہ کو میں مختلف رنگوں کا لباس پہنے اس جلسے کے مختلف کونوں میں دیکھتا ہوں۔ صائمہ چونکہ میری واقف کار نہیں اور خود بے چینی کی حالت میں ہے اس لئے میں اس سے سفارش نہیں کروا سکتا۔ اسی جلسہ میں مجھے پروفیسر کی اسسٹنٹ ہنی بیگم بھی نظر آتی ہے جس کا لباس وہی ہے جو وہ عموماً پہنتی ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ وہ پروفیسر کی دعاؤں میں شامل نہیں بلکہ جلسہ گاہ میں گھوم پھر کر لوگوں کو دیکھ رہی ہے جیسے لوگوں کی کیفیات اور تعداد کا اندازہ کر رہی ہو۔ میں خود بھی ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے جلسہ گاہ کا نظارہ کر سکتا ہوں مگر جلسہ گاہ میں موجود نہیں۔ جلسہ گاہ میں موجود لوگ بالکل ساکت وجامد ہیں جیسے مادام ٹسوری کے میوزم میں موم کے پتلے۔ اس سارے جلسے میں پروفیسر اللہ لوک، پرفیسر کا ہم شکل، چھ نقاب پوش اور ہنی بیگم حرکت میں ہیں جبکہ صائمہ اپنی جگہ کا تعین کرنے کی حالت میں ہے۔ جلسہ گاہ بلکہ دعا گاہ کی مجموعی کیفیت بھی کچھ عجیب ہے۔ پروفیسر کا ہم شکل ایک نورانی مقام پر ہے جبکہ پروفیسر اور چھ نقاب پوش کارگل کے شہیدوں کے خون سے آنے والی خوشبو اور چودھویں کی رات صحرا میں شبنم کے قطروں سے پیدا ہونے والی ٹھنڈک کے مقام پر ہیں۔ سارہ، سیما، رانی۔ شبنم اور دیگر خواتین اور ان کے دوست پتھریلی زمین پر ہیں جیسے طورخم سے جلال آباد جانیوالی سڑک کے دائیں جانب نالے میں کھڑے ہوں۔ دیگر حاضرین سبزہ زار پر ہیں جس پر سرسر کرتا پانی بہہ رہا ہے جیسے آسٹروٹرف کا میدان بچھا کر ایک جانب سے پانی چھوڑ دیا گیا ہو۔

پروفیسر اللہ لوک کی دعاؤں کا سلسلہ جاری ہے کہ میں ہاتھ ہلا کر ہنی بیگم کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہوں تا کہ پروفیسر کو اپنا نام بتا کر دعا کی گزارش کروں مگر ہنی بیگم قریب آنے کے بجائے اپنی جگہ سے ہی جواب دیتی ہے کہ اس دعا میں تمہاری شرکت ممکن نہیں چونکہ پروفیسر اللہ لوک آج کے جلسہ میں نہیں آئے۔ میں اپنی جگہ ہی سے ہنی بیگم کو پکارتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ یہ دو چٹانوں پر بیٹھے دو ہم شکل کون ہیں۔۔۔ دو چٹانوں پر تو کوئی نہیں۔۔۔ پہلی چٹان پر پروفیسر اللہ لوک کے مرشد ہیں اور دوسری چٹان پر ان کا سائیہ ہے۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ پہلی چٹان پر بیٹھی ہستی نے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھا رکھے ہیں جبکہ دوسری چٹان پر بیٹھا شخص یا سائیہ مختلف حرکات کرتا ہے۔۔۔ اگر یہ سائیہ ہے تو اسے اپنے

اصل کی طرح ہی متحرک ہونا چاہیے۔ میں نے ہنی بیگم سے پوچھا؟ ہاں یہ سایہ ایسے ہی ہوتا ہے جس کی تمہیں سمجھ نہیں بلکہ پروفیسر اللہ لوک خود اس علم کی ابتدائی منازل پر ہیں۔ بلکہ یوں کہوں کہ ابھی سفر کا آغاز ہی ہوا ہے۔ یہ منزل فنافی الشیخ کی ہے جہاں طالب و مطلوب ایک ہی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حرکات ایک سے دو بلکہ دو سے زیادہ بھی ہوسکتی ہیں۔ فنافی الشیخ کی منزل عالم ناسوت سے آگے کی منزل ہے۔ یوں تو عالم ناسوت کی اکتالیس منازل ہیں اور بعض اوقات ایک طالب زندگی بھر کی محنت کے باوجود ان منازل کو طے نہیں کرسکتا۔ مگر شیخ کامل چاہے تو طالب حق کو ایک ہی آن میں ناسوتی سمندر سے نکال کر ایک ہی لمحے میں عالم ملکوت تک پہنچا سکتا ہے جس کی ابتداء فنافی الشیخ کی منزل ہے۔ دیکھو میں اس سے زیادہ تمہارے قریب نہیں آسکتی میں اس وقت دعا کے دائرے میں ہوں اور تم دائرے سے باہر ہو تمہاری طلب اور مسائل کی نوعیت ایسی ہے کہ دعا میں تمہارا نام شامل نہیں کیا جا سکتا۔ تمہیں اپنے مسائل کی فہرست پروفیسر کو دینی ہوگی بلکہ ایک خط یا درخواست کی صورت میں اپنے مسائل بیان کرنا ہونگے۔۔۔ صائمہ دائرے میں کیسے آگئی ہے۔ وہ بھی تو طالب دعا نہیں۔۔۔ میں نے ہنی بیگم سے پوچھا۔ وہ ریسرچ سکالر بننا چاہتی ہے اور ریسرچ کی طالبہ ہے۔ وہ بیک وقت بہت سے کام کرنا چاہتی ہے مگر فیصلہ نہیں کرسکتی۔

کیا تم دائرے کے قریب آسکتی ہو۔۔۔ میں نے ہنی بیگم سے پوچھا۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔۔ مگر فائدہ نہیں۔۔۔ اب سورج غروب ہونے والا ہے اور دعا کا وقت بھی ختم ہے۔ بس یہی قبولیت کی گھڑی تھی مگر آمین کہنے والے پروفیسر کی طرح چوزی ہیں۔ انہیں ہر نام پر آمین کہنے کا حکم نہیں۔ یہاں ہر ایک کی دعا رجسٹرڈ ضرور ہوتی ہے مگر قبولیت نہیں ہوتی۔ یہ گھڑی پھر کب آئے گی۔ میں نے پوچھا؟ مجھے اس کا علم نہیں۔ پروفیسر اللہ لوک بھی اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ وہ بھی دعائیں رجسٹرڈ کرواتے ہیں بلکہ ہر ولّی عموماً یہی کرتا ہے جو اصل میں پیغمبرانہ فعل ہے۔ پیغمبروں کی دعائیں بھی رجسٹرڈ ہوتی تھیں جیسے حضرت موسیٰؑ کی دعا! موسیٰؑ نے کہا اللہ مجھے اور میری قوم کو فرعون سے نجات دلا تو اللہ نے دعا قبول کر لی جو کہ ایک رجسٹریشن ہی تھی۔ رجسٹریشن کیسی؟ فرعون تو سمندر میں غرق ہوگیا تھا۔ ہاں ہوگیا تھا مگر پچھتر سال بعد۔ اسی دن نہیں۔ ہنی بیگم نے جواب دیا۔ موسیٰؑ کی دعا پر آمین کہنے والی موسیٰؑ کی ماں تھی تب جلدی ہوگئی ورنہ زیادہ وقت بھی لگ سکتا تھا۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ دعا مانگتے رہو۔ یہ موسیٰؑ کا دور نہیں۔ ہم جس نبی ﷺ کے اُمتی ہیں وہ اللہ کے سب سے برگزیدہ بندے اور رسول ﷺ ہیں۔ دعا کے ساتھ درود کی کثرت جلد قبولیت کا وسیلہ ہے۔ درود کی کثرت سے پچھتر سالوں کی مسافت پچھتر سیکنڈوں میں طے ہو جاتی ہے۔ جیسے عالم ناسوت کی اکتالیس منازل ایک ساعت میں طے کر کے طالب حق فنافی الشیخ کی منزل سے عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے۔ کیا پروفیسر اللہ لوک عالم ملکوت میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے ہنی سے پوچھا۔ دس از پرسنل سیکرٹ یو مے آسک حمِ۔

(۳)

کیاتم نے میاں محمد بخشؒ کو کبھی پڑھا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ پردہ پوشی فقر کا لازمہ ہے اور ہر فقیر یعنی طالب حق وحدت کے پردے کی اوٹ میں رہتا ہے۔مگر تم ان مسائل میں کیوں اجلتے ہو؟ تم اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کے حل پر توجہ دو یا پھر طالب بن جاؤ۔ دو کشتیوں کی سواری کا نہ سوچو۔ طالب بننا مشکل کام نہیں مگر مطلوب کو پانا انتہائی مشکل ہے۔ اب صائمہ ہی کو دیکھو وہ طالبہ ہے مگر طلب سے آشنا نہیں۔ ہنی بیگم کے ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی دعا کے میدان کا نقشہ ہی بدل گیا جیسے کسی نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر ٹی وی کا چینل بدل دیا ہو۔ منظر بدلا تو ہم دونوں آمنے سامنے پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے میں بیٹھے تھے مگر برآمدے کی چھت نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ میں برآمدے کے متعلق پوچھتا ہنی بیگم نے خود ہی وضاحت کر دی کہ پروفیسر کے برآمدے کی چھت سمبولک ہے اور یہ قومی زوال کی نشانی ہے۔

پروفیسر اللہ لوک کا تعلق روحانی دنیا سے ہے جو کہ تخلیق کائنات کی اصل حقیقت ہے۔ روح سے ہی مادہ تخلیق ہوتا ہے اور روح کے قیام سے مادے کی حقیقت آشکارہ ہوتی ہے۔ روح جب کسی مادی شے سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو مادہ اپنی ہیت بدل لیتا ہے۔ میری تعلیمی قابلیت اور ذہنی پستی کا اندازہ کرتے ہوئے ہنی بیگم نے آسان الفاظ میں بتایا کہ مادے کی ہیت میں تبدیلی کو ہم زندگی اور موت، عروج و زوال، بہار اور خزاں۔ خوشی اور غم، پیدائش اور موت۔ عمدہ اور گھٹیا۔ حرکت اور ساکت یا پھر بلند و پست بھی کہہ سکتے ہیں۔ روح کے ساتھ حسن و آسائش بھی منسلک ہے جو مادے میں نکھار پیدا کرتی ہے جبکہ بے روح مادہ اپنی پہچان کے ساتھ موجود تو ہوتا ہے مگر بے وقعت و کم مائیہ حیثیت میں محض گلی کا پتھر ہی رہ جاتا ہے۔

تم پروفیسر کے برآمدے کی چھت کے متعلق کہہ رہی تھی۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ چھت سمبولک ہے چونکہ روح کی حقیقت اور مادے کے وقعت پر تحقیق کرنے والے طالبان حق جس ملک اور بستی کے مکین ہوں وہ اس بستی، شہر اور ملک کے باشندگان کے اعمال اور حکمرانوں کے کردار کے روحانی عروج و زوال کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ ایک ولیؒ اور طالب حق کی عام زندگی عوام الناس کی زندگیوں کے اثرات سے منسلک ہوتی ہے اور کسی بھی نبی اور ولیؒ کیلئے ممکن نہیں کہ وہ اپنی بستی، شہر یا ملک اللہ کے حکم کے بغیر چھوڑ کر ہجرت کرے ورنہ حضرت یونسؑ کی طرح سخت پکڑ ہوتی ہے۔ تم چونکہ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے میں بیٹھے ہو اس لئے تمہیں یہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ منظر تم اپنی کسی خوبی یا قوت سے نہیں بلکہ نبی پاک ﷺ پر صبح کے وقت پڑھے جانے والے دورد پاک کی برکت کا ایک جھونکا ہے۔ وہ لوگ جن کا تزکیہ و مجاہدہ مبنی بر حقیقت ہے وہ قلب و نظر کی لطافت سے دیکھ رہے ہیں کہ طالبان حق سرزمین پاکستان کے جس جس علاقہ میں پیوند خاک ہیں ان کے سروں پر چھت نہیں۔ وہ اس بے بس و بے آسرا قوم کیلئے دعائیں بھی کرتے ہیں مگر آمین کہنے والا کوئی نہیں۔ جب کوئی طالب اللہ کی بارگاہ میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو ملائیکہ سمیت مقدس اور نیک روحیں اور اللہ کے نیک بندے آمین کہتے ہیں۔ درحقیقت آمین ہی دعا کی قبولیت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کوئی بھی ولیؒ اور طالب حق بددعا نہیں کر سکتا چاہے مخلوق اسے کتنی ہی اذیت کیوں نہ دے۔ وہ سب کی بخشش اور سب پر اللہ کی رحمت کے نزول کی طلب کرتا ہے۔

طالب حق کی ہر دعا قبول بھی نہیں ہوتی مگر رجسٹرڈ ضرور ہو جاتی ہے۔ بعض دعائیں سائل کے حق میں فائدہ مند ہوتی ہیں جو اللہ کی رضا سے شرف قبولیت پاتی ہیں اور جو دعائیں سائل کے حق میں بہتر نہیں ہوتیں یا وقتی فائدے کے بعد بڑے نقصان کا موجب بنتی ہیں تو اللہ ہی کی رضا سے ایسی تمام رجسٹرڈ دعائیں سائل کی آخری اور ہمیشہ کی زندگی کی بہتری کیلئے اس کے بہی کھاتے میں لکھ دی جاتی ہیں۔

میں برآمدے کی چھت کے متعلق بتا رہی تھی۔۔۔ یہ چھت سمبولک ہے چونکہ پاکستان کے عوام بے حس اور حکمران بے رحم ہیں۔ نہ عوام اور نہ ہی حکمران اس قابل ہیں کہ ان کے حق میں دعا قبول ہو۔ حکمران غیروں کے غلام ہیں اور بے دین قوتوں کو اپنا نجات دھندہ سمجھ کر اپنے آرام و آسائش کی خاطر اپنے ہی عوام کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ حکمران عوام کے سر کا تاج، ان کی عزت و آزادی کا محافظ اور ریاست کی مضبوط عمارت کی چھت ہوتا ہے۔ پاکستان کو ایک مضبوط عمارت کے بجائے روز اول ہی سے مٹی کا گروندہ بنا دیا گیا جس پر لکڑ کاٹھ اور سرکنڈوں کی چھت ڈال دی گئی۔ مٹی کے اس گروندے کو سب سے پہلے سیاستدانوں نے نقصان پہنچایا اور محلاتی سازشوں کا جال بچھا کر قائداعظم کی منصوبہ بندی کو زچ کیا۔ کشمیر بھارت کے حوالے کیا اور ملک میں افراتفری کی بنیاد رکھی جو آج دہشت گردی میں بدل چکی ہے۔ جسٹس منیر نے عدل کا خون کر کے برادری ازم کی لعنت کو قانونی شکل دیکر پاکستان کے چہرے پر ایک بدنما داغ کندہ کر دیا جسے مقدس مورتی سمجھ کر آج گجرات کے چوہدریوں نے ایوان صدر کے دروازے پر

نصب کر دیا ہے اور جنرل مشرف پتھر کی اس دیوی کے طواف کو اپنے لئے وسیلہ نجات سمجھ بیٹھے ہیں۔

جنرل مشرف کچھ عرصہ کمانڈو بھی رہے ہیں مگر ان کی تربیت توپخانے کے افسر کی حیثیت سے ہوئی ہے جہاں وقت اور فاصلے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وقت پر اور صحیح جگہ توپ نصب کی جاتی ہے اور وقت پر گولہ فائیر ہوتا ہے تا کہ وہ صحیح وقت پر صحیح جگہ گرے۔ جنرل مشرف کو پتہ ہے کہ لندن، واشنگٹن اور دبئی کا فاصلہ کتنا ہے اور کتنے وقت میں جہاز اسلام آباد یا پھر لاہور پہنچ سکتا ہے۔ واشنگٹن والا بابا اکثر و بیشتر جنرل مشرف کو اس وقت اور فاصلے کی اہمیت یاد دلاتا رہتا ہے اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس نے حامد کرزائی اور من موہن سنگھ کو بھی بتلایا ہوا ہے کہ اگر میں اپنے ہفتہ وار قومی خطاب یا کسی اور وجہ سے جنرل مشرف کو چتاونی نہ دے سکوں تو تم انہیں میری طرف سے سخت الفاظ میں دہشت گردی، ناکام ریاست کی حکمرانی، ڈاکٹر قدیر کی حوالگی، ادھوری جمہوریت، غیر شفاف الیکشن اور جناب اسامہ بن لادن کے حوالے سے یاد دہانی کروا دینا تا کہ وزیرستان اور بلوچستان کا آتشکدہ ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔

یہی حال پنجاب اور سندھ کا ہے جبکہ کشمیر میں جنرل انور نے جنرل مشرف کے خاص نمائندے کی حیثیت سے سکندر حیات کا پیٹ ایک انچ نہیں بڑھنے دیا اور کوشش کی ہے کہ آزاد حکومت ڈانواں ڈول رہے۔ جنرل انور پچاس گاڑیوں کے جلوس میں کراچی سے مظفر آباد تک دورے کرتا ہے اور دنیا کے ہر بڑے شہر کے شاندار ہوٹلوں میں اپنے دوستوں اور اہل خانہ کے ہمراہ کشمیر کاز کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال جنرل انور کے دوستوں اور پیاروں کا ہے جن کی ہر خواہش قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعض دوست فرعون اور شداد کی یاد تازہ کرتے ہیں جو موت اور زندگی دینے کے دعویدار تھے۔ جنرل انور سیلف میڈ آدمی ہے اور ہر سیلف میڈ آدمی نفسیاتی طور پر خطرناک اور انتہا پسند ہوتا ہے۔ سیلف میڈ آدمی کے دو ہی رخ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک رخ ولّی کامل کا رخ اور مقام ہے اور دوسرا ہٹلر، لینن اور موجودہ دور میں عبدالرشید دوستم کا ہے۔ جنرل انور آزاد کشمیر کا پہلا صدر ہے جس نے اپنے دوستوں اور پیاروں کی خاطر شوٹ ٹوکل کے حکم کے ساتھ ایس ایس پی مظفر آباد کو مشن پر روانہ کیا مگر اللہ نے اس کی یہ خواہش پوری نہ کی اور ایس ایس پی اگر بارسیلونا نہیں گیا تو عالم برزخ میں ضرور ہوگا اور وہ اللہ کی عدالت میں جنرل انور اور اسکے دوستوں کے اس حکم اور ارادے کی گواہی بھی ضرور دے گا چونکہ ایک دن جنرل انور اپنے غرور اور تکبر کی وردی سمیت اپنے یاروں اور پیاروں کے ہمراہ اللہ کی عدالت میں ضرور طلب کیا جائے گا جہاں کسی کی جرنیلی اور صدارت کام نہیں آتی۔ لیکن جنرل انور تو نیک آدمی مشہور ہے۔ میں نے پوچھا؟ ہاں آدمی تو نیک ہے مگر دوستوں کی خواہشات کو ٹھکرا تا نہیں چاہے کسی کی لاش گرے یا کسی کی عزت و ناموس کا جنازہ نکلے۔ اس کے نزدیک دوستوں کو خوش رکھنا اور تکبر سے جینا مردانگی اور جرأت کی علامت ہے اور اس کے دوست اسے باجرأت جرنیل ثابت کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ مگر وہ کسی کو پولیس سے اغوا کروا کر یا اٹھوا کر قتل کیسے کروا سکتا ہے۔ میں نے حیرت سے پھر پوچھا؟ کیوں نہیں کروا سکتا؟ ایک بے سہارا اور بے بس آدمی کو قتل کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ پھر اس قتل سے جنرل کے دوستوں کی تسکین جو ہونی تھی۔ دراصل اسے پولیس مقابلہ، خودکشی یا پھر حوالات میں ایک دیوانے شخص کے ہاتھوں قتل ظاہر کیا جانا تھا۔ اور اس مقصد کیلئے دیوانہ بمعہ پستول پہلے سے حوالات میں پہنچا دیا گیا تھا اور عدلیہ کو اس مسئلے پر خاموش رہنے کا اشارہ بھی مل چکا تھا۔ اس ڈرامے کی مکمل تیاری پر جنرل انور کے دوستوں نے تین ماہ تک کام کیا اور توہین عدالت کا مقدمہ بنا کر مطلوبہ شخص کے قتل کو خودکشی، پولیس مقابلہ یا پھر دیوانے کے ہاتھوں قتل کی جوڈیشنل انکوائری کے لئے جج تک مقرر کر دیا گیا تھا۔ جج نے جنرل انور کے دوستوں کی تیار کردہ کہانی کے مطابق جوڈیشنل انکوائری پہلے سے ہی تیار کر رکھی تھی جس پر موت کی تاریخ اور وقت لکھنا باقی تھا۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ میں نے خوف سے پوچھا۔۔۔ مگر اللہ کی اپنی خواہش ہوتی ہے وہ جسے چاہے زندہ رکھے اور جسے چاہے مار دے۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔

ہاں تو! بات ہو رہی تھی جنرل مشرف کی اور میں چل پڑی جنرل انور کی طرف۔ بات کس کس کی کریں ہنی بیگم کچھ اداس لہجے میں بولی! دراصل ہر جنرل کی ایک کہانی ہے اور ہر سیاستدان کا ایک قصہ ہے۔ یہی قصے اور کہانیاں ہمارے زوال کی داستانیں اور تاریخ کے سیاہ ابواب ہیں۔

تم جنرل مشرف کی بات کر رہی تھی۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ہاں وہ توپخانے کے افسر ہیں اور وقت اور فاصلے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا تعلق نہ تو مارشل ریس سے ہے اور نہ ہی سرحد، پوٹھوہار، جہلم اور میانوالی کے رہائشی ہیں۔ حکمران مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری اور جلاوطنوں کے سابق وزیر اور مشیر مشاہد حسین سید دو سال قبل لندن میں ہونے والی کشمیر کانفرنس میں شرکت کے بعد برٹش ائیر ویز کی پرواز سے وطن واپسی کیلئے ہیتھرو ائیر پورٹ پر آئے تو وہاں کشمیری ٹیکسی ڈرائیوروں کے ایک گروپ نے رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں انہیں چائے پلائی چونکہ شاہ جی مسافر تھے اور مسافر پر روزہ فرض نہیں ہوتا۔ ان ڈرائیوروں نے شاہ صاحب سے دو سوال پوچھے۔ پہلا سوال یہ کہ جنرل عزیز ریٹائیرڈ ہو گئے ہیں اور خبر ہے کہ انہیں آزاد کشمیر کا صدر اور جنرل انور کو برطانیہ میں ہائی کمشنر لگایا جا رہا ہے اس سے پہلے کہ شاہ صاحب کوئی ڈپلومیٹک جواب دیتے ایک ڈرائیور نے ٹکا کر کہا کہ اگر ایسے ہوا تو آئندہ ہم لوگ ایسی کانفرنسوں اور دوروں کے لئے چندہ نہیں دیں گے۔ اب بہت ہو گئی ہے۔ ایک سدھن صدر اور دوسرا سفیر اور وہ بھی ہمارے خرچے پر۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا دوسرا سوال اور بھی کڑوا اور زہر آلود تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا جنرل مشرف کے ٹیک اوور کے ٹائم پر کبھی آپ نے غور کیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ چوہدری صاحب مجھے بات سمجھ نہیں آئی۔ شاہ جی اگر آپ ٹیک اوور ٹائم پر نظر ڈالیں تو فوج نواز شریف کے ایکشن سے پہلے ہی حرکت میں

آ چکی تھی۔شاہ صاحب نے جواب دیا کہ اس کے ذمہ دار جنرل مشرف نہیں بلکہ جنرل عزیز، جنرل محمود اور جنرل عثمانی ہیں اور وہ اب وردی میں نہیں۔۔۔ہاہاہا۔۔۔کہہ کر شاہ صاحب وطن واپسی کیلئے چل دیئے چونکہ اس ٹائم کا شاہ صاحب پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا مگر جنرل مشرف کو اس کا پورا احساس ہے۔

واشنگٹن والا بابا بھی اس ٹائم کو اہمیت دیتا ہے اور اپنی سٹاف واچوں پر دونوں ٹائم۔یعنی نواز شریف اور فوج کے حرکتی ٹائم اس نے محفوظ کر رکھے ہیں۔یہ ٹائم پاکستانی قوم کیلئے برا ٹائم تھا بلکہ لیاقت علی خان، سکندر مرزا، محمد علی بوگرا، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاؒ الحق کے ٹیموں سے بھی یہ ٹائم برا تھا۔یہی سمجھو کہ جنرل مشرف کا ٹیک اوور ایک سرخ آندھی تھی جو لکڑ کاٹھ اور سرکنڈوں کا چھت اڑا کر لے گئی۔واشنگٹن والا بابا بھی آدم خور قسم کا ہے۔اسے ہر روز مسلمانوں کا تازہ خون نہ ملے تو اسے نیند ہی نہیں آتی۔فی الحال خون سپلائی کا ٹھیکہ پاکستان، افغانستان، عراق، کشمیر اور فلسطین میں دیا گیا ہے جبکہ اکا دُکا مسلمانوں کو یورپ اور امریکہ میں بھی ذبح کر کے ان کے جسم سے غیرت مند خون نکالا جاتا ہے۔حال ہی میں جرمنی میں عامر چیمہ نامی پاکستانی کو قربانی کیلئے منتخب کیا گیا چونکہ اس کی رگوں میں بھی غیرت تھی۔ایسے ہی کچھ مسلمان بگرام جیل میں رہتے ہیں۔یہ سب جنرل مشرف کے ٹائم آف ٹیک اوور کا نتیجہ ہے جبکہ جنرل مشرف خود اس معاملے میں بے بس ہیں۔واشنگٹن والے بابے نے محمد علی بوگرہ کی جگہ شوکت عزیز کو مٹی کے گروندے کی کچی دیواروں کو کھوکھلا کرنے کیلئے بھیجا ہے جو بینکاروں، صنعتکاروں، کارخانہ داروں، پراپرٹی ڈیلروں اور سٹاک مارکیٹوں کو تحفظ دینے اور ان پیشوں سے منسلک افراد کو کروڑ سے ارب پتی بنانے کیلئے دن رات محنت کر رہے ہیں۔جناب شوکت عزیز کا دعویٰ ہے کہ عوام کا خون چوس چوس کر جب ان جنوں کا پیٹ بھر جائے گا تو ان کی آنکھوں، کانوں، منہ اور ناخنوں سے دودھ اور شہد بہنا شروع ہو جائے گا تو عوام پیالے بھر بھر کر پئیں گے اس طرح ملک خوشحال اور قوم آسودہ حال ہو جائیگی۔ان جنوں کا پیٹ بھرنے کیلئے فی الحال عوام کو مزید قربانی دینی ہوگی ورنہ معیشت کے ٹرکل ڈاؤن افکٹ نظر آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔شوکت عزیز کا چیلا عمر ایوب اکثر غصے میں رہتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ عوام انتہائی درجے کے کم عقل ہیں انہیں حکومتی پالیسیوں کے ثمرات نظر ہی نہیں آتے جبکہ عمر ایوب کے سب رشتہ داروں کی دولت میں شوکت عزیز کی حکومت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔اگر کسی کو شک ہے تو بنک مالکان، شوگر ملز مالکان، پراپرٹی ڈیلروں، قبضہ مافیا، واٹر مافیا، سیمنٹ فیکٹریوں کے مالکان، کاریں بنانے اور اسمبل کرنے والے کارخانہ داروں اور سٹاک مارکیٹوں کے سٹے بازوں سے پوچھ لے۔ہم نے انہیں ایسے ایسے گر سکھائے ہیں کہ کروڑ پتیوں کو ارب پتی ہی نہیں بلکہ کھرب پتی بنا دیا ہے۔خوشحالی اور روشن خیالی کی ہزاروں مثالیں ہمارے سامنے ہیں مگر کئیں غیرت کا جنازہ ہے تو کئیں عدل وانصاف کا قتل جبکہ بے حسی، بے مروتی اور بد اخلاقی کو ہم نے عام آدمی کی زندگی کا حصہ بنا دیا ہے اور اس پروجیکٹ پر مزید کام بھی جاری ہے۔

خلیفہ کے اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں صرف دس ہزار لوگوں کے سر پر عارضی چھت ہے جنہیں بیک وقت حکومت پاکستان اور واشنگٹن والے بابے کی آشیرباد حاصل ہے۔ان دس ہزار خوش قسمت مسلمان نما پاکستانیوں میں اسمبلی ممبران، سینٹ کے معزز اراکین، کچھ چنے ہوئے جج صاحبان، جنرل صاحبان، بیوروکریٹ، کچھ صحافی، دانشور، صنعت کار اور انہیں پیشوں سے متعلق ریٹائیرڈ افسران شامل ہیں جنہیں بابا سام کی مرضی ومنشأ کے مطابق دوسرے ملکوں میں سفیر یا پھر اندرون ملک گورنر، کیئر ٹیکر صدر اور وزیر اعظم لگانے کیلئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ان دس بارہ ہزار سروں پر چھت تو ہے مگر یہ چھت ان کی اپنی نہیں بلکہ کسی کی غلامی کو آزادی تصور کرنے اور خودداری وعزت نفس کو بیچنے کا عارضی صلہ ہے۔

ان دس ہزار لوگوں کے ہاتھوں میں باقی ماندہ سولہ کروڑ پاکستانیوں کی تقدیر ہے۔وہ جسے چاہیں مالا مال کر دیں اور جسے چاہیں کنگال! کوئی عدالت، کوئی جج، کوئی پیر فقیر اور سادھو سنت عام آدمی کو پاکستان کی اس اشرافیہ کے قہر وغضب سے بچا نہیں سکتا۔ایسا کیوں ہے؟ کہاں سولہ کروڑ اور کہاں دس بارہ ہزار۔میں نے پوچھا؟ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔بنی بیگم بولیں۔۔۔مگر جب لوگ نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو بے وقعت اور حقیر سمجھنے لگیں تو ان کی عددی برتری کچھ معنی نہیں رکھتی۔اب تم جمہوریت ہی کو لے لو۔میں ایک حلقے کے لوگوں کو جانتی ہوں جہاں کل ووٹروں کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔کچھ عرصہ پہلے ایک غنڈے نے سمگلنگ سے مال جمع کیا اور پندرہ بیس کرائے کے قاتل اور لٹیرے بھرتی کر لئے۔اپنی گاڑی کے آگے پیچھے دس دس گاڑیوں میں ان قاتلوں اور لٹیروں کو بٹھا کر حلقہ بھر کا دورہ کیا اور لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائی۔اسلام آباد میں ایک بڑی عالیشان کوٹھی خریدی اور اخباری نمائندوں اور بھوکے پیاسے سیاستدانوں کو دعوتیں دیں اور ایک سدا بہار صحافی کو جو آج کل ٹیلی ویژن پر قومی غیرت اور ملکی وحدت کا درس دیتا ہے کو اپنا پریس اینڈ پراپیگنڈہ مشیر لگایا اور ڈیڑھ لاکھ ماہانہ مقرر کیا۔کچھ ججوں پولیس والوں اور دوسرے اعلیٰ سرکاری افسروں، سیاستدانوں اور چند جرنیلوں کی دعوتیں کئیں تحفے دیئے اور ولائت کی سیر بمعہ شاپنگ اور عمرہ کروائی۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ غنڈہ دس ہزاری اعلیٰ اشرفیہ کے کلب کا مقدس ممبر، مشہور سیاستدان اور پارلیمنٹیرین بن گیا۔اب الیکشن سے پہلے وہ کسی کو نوٹ دکھاتا ہے اور کسی کو قتل کرواتا ہے کسی پر تشدد کرواتا ہے تو کسی کو جلاوطن کروا دیتا ہے۔اس کے عتاب کے مارے، بہت سے مظلوم جیلوں میں گل سڑ رہے ہیں اور کوئی جج غنڈے کی مرضی کے بغیر ان کی ضمانت نہیں لے سکتا۔جھوٹے مقدمے بنوانا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے جبکہ کھربوں روپے کی پراپرٹی بیرون ملک اور اربوں کی اندرون ملک ہے مگر احتساب بیورو کو اس کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔اب تم خود بتاؤ ایسے بدمعاش کو ووٹ نہ دے کر کون اپنی بچی

کھچی عزت اورامن تباہ کریگا۔

پاکستان میں ایسی ہی جمہوریت ہے جس کی وجہ سے لوگ آمریت اور جمہوریت میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔اب اس ملک کے عوام کی آخری خواہش یہی ہے کہ وہ پاکستان نامی گھروندے کی کچی دیواروں میں آخری سانسیں لیں اور یہی دفنا دیئے جائیں۔اب ان کے پاس لٹانے کیلئے کچھ باقی نہیں۔اگر واشنگٹن والے بابے نے ایران کے بجائے غلطی سے یا جان کر پاکستان پر دوچار بم برسا دیئے تو بھی فرق نہیں پڑے گا۔چونکہ خودکشی سے اجتماعی شہادت بدرجہا بہتر ہے۔میں نے کہا تھا ناں کہ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے کی چھت سمبولک ہے۔ہاں ہنی بیگم اب مجھے سمجھ آ گئی ہے۔واقعی ہم بے چھت اور بے سہارا ہیں۔ہمارا حکمران کسی اور کا ملازم ہے۔ہمارا جج خود انصاف کا طلبگار ہے اور جس نے اسے جج لگوایا ہے اسے اسی کا وفادار رہنا ہے۔جس نے اس کے لیے جج کی سرکار سے خریدی ہے، جج نے اسی کے نمک کا حق بھی تو ادا کرنا ہے۔پولیس اور دیگر انتظامی محکموں کے تبادلے اور پروموشن میرٹ اور معیار پر نہیں بلکہ اعلیٰ اشرافیہ کی خدمت پر ہوتے ہیں۔ظالم اور سفاک تھانیدار ہی اچھا پولیس مین کہلاتا ہے اور اسے عوام کی بیخ کنی اور ظلم و بربریت کی آخری انتہا چھونے پر قائداعظم گولڈ میڈل دیکر قائداعظم کی توہین کی جاتی ہے۔ہماری پولیس کو ہلاکو، چنگیز خان اور دوستم میڈل دینا چاہیے۔۔۔ قائداعظم کوئی تھانیدار تھے؟اگر قائداعظم میڈل دینا ہی ہے تو کسی وکیل، جج یا پھر سیاستدان کو دیں۔میری عقل کے مطابق سوائے شہداء کے کوئی پاکستانی اس میڈل کے لیے کوالیفائی نہیں کرتا ہے۔

تم غنڈے لیڈر کی بات کر رہی تھی۔۔۔میں نے ہنی کی بات کا تسلسل توڑا۔۔۔ہاں۔۔۔ہمارے سیاستدانوں کی سیاسی تربیت ایسے ہی لوگوں کے گھروں میں ہوتی ہے۔ایسے غنڈوں کے باڈی گارڈ، دوست یار، رشتہ دار، بیٹے، بیٹیاں اور بھانجے بھانجیاں مستقبل کے سیاستدان اور پارلیمنٹیرین ہیں جنہیں چیلنج نہیں کیا جاسکتا ہے۔۔۔کیا تم اخبار پڑھتے ہو۔۔۔ہنی بیگم نے پوچھا۔۔۔ہاں کبھی کبھی۔۔۔اگر اخبار خریدنے کے پیسے ہوں تو۔ورنہ گلی کی نکڑ پر پان سگریٹ کا کھوکھا ہے جو رات دیر تک کھلا رہتا ہے وہاں کیبل والا ٹی وی بھی ہے اس پر خبریں دیکھ لیتا ہوں یا پھر تبصرے وغیرہ سن لیتا ہوں۔میں نے جواب دیا۔دیکھو۔اخباروں میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ فلاں حلقہ منی لاڑکانہ ہے۔اگر ہمارا لیڈر کھمبے کو اپنی جگہ کھڑا کر دے تو ہم اسے بھی ووٹ دینگے۔یہ منی لاڑکانہ حقیقت میں بدمعاشی، ذہنی پستی اور غنڈہ گردی کی علامت ہی نہیں بلکہ لاڑکانے والے عظیم سیاستدان کی سیاسی عظمت اور بصیرت کی توہین بھی ہے۔وہ کیا سوچ رہا ہوگا کہ اس کی سیاسی دانشوری کی دولت پر چوروں اور نودولتیوں نے قبضہ کرلیا ہے جبکہ اس کے وارثوں نے چند سکوں کی خاطر جرائم پیشہ لوگوں کو ایک عظیم سیاسی مفکر کے عقلی ورثے کا مالک بنا دیا ہے۔یہ جمہوریت نہیں اور نہ ہی جمہوریت میں ایسے دعوے کئے جاتے ہیں چونکہ ایسے دعوے جمہوریت کی نفی کرتے ہیں۔کھمبے کی مثال بھی انسانیت کی تذلیل ہے۔جیسے واشنگٹن والے ظالم بابے نے آدھی رات کے وقت مشرف صاحب کو فون پر کہا کہ اگر تم میرے ساتھ نہیں تو تمہیں دشمن کا ساتھی تصور کیا جائے گا۔بلکل ایسی ہی زبان ہماری سیاسی قیادت کی ہوتی ہے کہ اگر مجھے ووٹ نہ دیا تو تھانیدار اور پٹواری کا میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ اور یہ بھی سوچ لو ان کا لکھا چیف جسٹس بھی نہیں مٹا سکتا۔

ایسی ہی مثال پروفیسر کی چھت کی ہے چونکہ سولہ کروڑ لوگوں کے سر پر چھت نہیں۔ان کی عزت نہیں۔ان کا وقار نہیں۔ان کے حقوق نہیں۔ان پر رحم نہیں کیا جاتا۔ ان کی حفاظت نہیں تو پروفیسر کے سر پر چھت کیسے ہوسکتی ہے۔۔۔اللہ کا ولّی۔۔۔ہاں اگر ولّی ہو تو وہ عام لوگوں میں سے ہوتا ہے اور خود بھی عام ہی رہتا ہے۔وہ ان کا نمائندہ اور غمخوار ہوتا ہے۔وہ ججوں، جرنیلوں، بیوروکریسی اور سیاسی لیڈروں کا پیر نہیں ہوتا چونکہ وہ جس نبی ﷺ کے باطنی امور کا وارث ہوتا ہے اس کی بھی دعا تھی کہ اے اللہ مجھے قیامت کے دن غریبوں سے اٹھانا۔۔۔خود سوچو۔۔۔ظالموں کا دوست اللہ کا ولّی کیسے ہوسکتا ہے؟

اس کا مطلب ہے کہ پروفیسر اللہ لوک ولّی ہیں۔میں نے پوچھا۔مجھے پتہ نہیں مگر باتیں اچھی کرتے ہیں۔انگریزی اچھی پڑھاتے ہیں۔کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ ہر دکھیارے کی بات سنتے ہیں اور ہر مظلوم کی آہ پر پروفیسر کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔پروفیسر کا کہنا ہے کہ حافظ فضل مالکؒ اور نورالدینؒ صاحب ولّی ہیں جبکہ مہرو بی بی کا تزکیہ بھی عروج پر ہے اور یہ تینوں بے گھر ہیں اور چھت سے بلکل بے نیاز۔اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں؟میں نے پوچھا۔تمہیں یاد نہیں۔میں نے کہا تھا کہ یہ پروفیسر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ہاں تمہیں ایک راز کی بات بتائی ہوں۔کوئی ولّی اور طالب حق اپنا مقام نہیں بتا سکتا۔اگر کسی کے منہ سے اپنے مرتبے اور مقام کے متعلق ایک لفظ بھی نکل جائے تو اسے تزکیے میں ڈال دیا جاتا ہے۔دیکھو!بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ اسے موت دیکر اس کے مقام پر دوسرا تعینات کیا جاتا ہے چونکہ اس شعبے میں ڈیموشن نہیں۔البتہ تزکیہ سخت ہے۔اپنے مقام کا اعلان صرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے کیا اور یہ مقام صرف اُن ہی کو حاصل ہوا چونکہ ان کی ماں کا تزکیہ ان کی پیدائش سے پہلے ہی عروج پر تھا۔

اچھا یہ بتا کہ اگر پروفیسر اللہ لوک اور اس طرح کے دوسرے لوگ اس دنیا میں اپنا وجود رکھتے ہیں تو مسلمانوں کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے کہ ان کی غلامانہ زندگیاں آزاد ہو جائیں اور وہ غیرت اور آزادی سے جئیں جیسے برطانیہ میں گورے جیتے ہیں۔میں نے ہنی بیگم سے سوال کیا۔۔۔نہ نہ۔۔۔ایسے دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔نہ پہلے ہوئیں نہ آئندہ ہونگی۔اگر لوگ کھمبوں کو ووٹ دینگے۔جگہ جگہ منی لاڑکانے بنیں گے۔علمائے کرام پرمٹوں اور سیٹوں کی سیاست کریں گے،علماءٔ ومشائخ چند سکوں کی خاطر

کونسلیں بنا کر اسلام آباد کے بڑے ہوٹلوں میں عیش کرینگے اور دانشور اسلام کی توہین اور نبی پاک ﷺ کی ذات کو موضوع بحث بنا کر واشنگٹن والے بابے کی خوشنودی کے لئے قرآنی تعلیمات کو بدلنے کے لئے بحث کرینگے۔ روشن خیالی کے نام پر بے حیائی مسلط کریں گے تو دعا کیسے قبول ہوگی۔ جب سولہ کروڑ انسان دس بارہ ہزار کی غلامی کو آزادی تصور کر کے ان کی مرضی ومنشأ کو اللہ کی رضا سمجھ لینگے تو نہ دعا قبول ہوگی اور نہ ہی تقدیر بدلے گی۔

دیکھو میاں! آدمؑ کی دعا قبول ہوئی مگر ایک طویل وچھوڑے کے بعد۔ نوحؑ کی دعا قبول ہوئی مگر طوفان کے بعد اور لوطؑ کی دعا قبول ہوئی مگر نا خلف اولاد اور قبیلے کی ہلاکت کے بعد۔ ایسے ہی ایوبؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، ہودؑ اور یونسؑ کی بھی دعائیں قبول ہوئیں مگر تز کیے کے بعد۔ موسیٰؑ کی دعا قبول ہوئی مگر سینائی کے تپتے صحرا کو عبور بھی تو کرنا پڑا۔ پھر سب سے افضل واعلیٰ بندے اور پیغمبروں کے سردار محمد عربی ﷺ کی دعا قبول ہوئی مگر ہجرت کے بعد۔ بدر میں فتح ہوئی مگر ۳۱۳ جانثاروں کو میدان جنگ میں لانے کے بعد۔ اُحد کی شکست فتح میں بدلی مگر دندان مبارک بھی تو شہید ہوئے۔ کربلا میں گردن کٹائی تو حسینؓ کو جنت کے نوجوانوں کی سرداری اور امت محمدی ﷺ کی رہبری کا شرف حاصل ہوا۔

بے حس، بے مروت، بے کار نفسیاتی مریضوں، کھمبوں کو ووٹ دینے والوں، بے انصافی کو مقدر کا لکھا سمجھنے والوں کے حق میں دعائیں قبول نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ہستی ہی مٹ جاتی ہے۔ پروفیسر اللہ لوک جو بھی ہیں مجھے اس سے غرض نہیں مگر ان میں حرکت ہے۔ وہ اپنے طالب علموں کو حرکت پذیری کی ترغیب دیتے ہیں اور بے انصافی کے خلاف لکھتے ہیں۔ وہ اپنی بساط کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ہوسکتا ہے ان کی کوشش سے کوئی کھمبا گر جائے۔ پروفیسر کو اللہ سے رحمت کی بارش کی امید ہے۔ وہ تپتے صحرا میں پھول کھلنے کی پشین گوئی نہیں کرتے چونکہ بارش کے بغیر پھول نہیں کھلتے۔

تم نے کہا تھا کہ صائمہ طالبہ ہے مگر اسے اپنی طلب کا پتہ نہیں۔ وہ کیسی طالبہ ہے؟ میں نے کبھی ایسے طالب یا طالبہ کا نہیں سنا جسے اپنی طلب یا مطلوب کا پتہ ہی نہ ہو۔ میں نے ہنی بیگم سے سوال کیا؟ مگر صائمہ کو طلب اور مطلوب کا پتہ نہیں۔ یہ بات مجھے بھی پتہ ہے اور پروفیسر اللہ لوک بھی بخوبی آگاہ ہیں ہنی بیگم نے جواب دیا۔ صائمہ ایک واجبی سی لڑکی ہے جسے قبول صورت کہا جا سکتا ہے۔ نہ بوٹا سا قد، نہ بڑی بڑی غزالی آنکھیں، نہ ستواں ناک، نہ غنچہ سا دھن، نہ شفاف چمکتا مہتابی ماتھا، نہ کمان بھنویں، نہ مرمرین کلائیاں، نہ ناگن سی چوٹی، نہ چمکتے موتی دانت، نہ گلابی ہونٹ، نہ عنابی گال، نہ صراحی دار لمبی گردن، نہ کاغذی کان، نہ سینے کی قیامت خیز اٹھان، نہ کوئل سی مدھر آواز اور نہ حیا کی ہوا سے اڑتی چنریا کا احساس۔۔۔ مگر وہ لڑکی ہے۔۔۔ اور کمال کی لڑکی ہے جسے لاکھوں میں ایک کہا جا سکتا ہے۔

دیکھو ہنی تم بھی ایک لڑکی ہو؟ ہاں میں لڑکی ہوں مگر نہ واجبی ہوں اور نہ ہی قبول صورت۔ میں تو بس ایک لڑکی ہی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ لڑکی ہوں مگر صائمہ ایک خاص اور باکمال لڑکی ہے جو حسن کے بغیر عشق کا دریا عبور کرنا چاہتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ کوئی لڑکی حسن کے بغیر عشق کا دریا عبور نہیں کر سکتی چاہے ساری دنیا کی بیوٹیشنز ملکر اس کا میک اپ کریں اسے عطر میں نہلائیں اور دنیا کا سب سے مہنگا لباس پہنائیں یا ہیروں اور موتیوں سے اسے لاد دیں۔۔۔ کیوں۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ دیکھو کبھی ایندھن کے بغیر گاڑی چلتی ہے۔ چپو کے بغیر کشتی دریا عبور کر سکتی ہے۔ سانس کے بغیر زندگی قائم رہ سکتی ہے۔۔۔ نہیں ناں؟۔۔۔ میں نے اس بات پر ہاں کی تو ہنی بیگم بولی ویسے ہی حسن کے بغیر عشق کی ندی میں کودنا خودکشی کے مترادف ہے۔ مگر ہنی ساری لڑکیاں حسین و جمیل تو نہیں ہوتیں۔۔۔ بلکل نہیں ہوتیں۔۔۔ ہنی نے جواب دیا۔۔۔ مگر وہ کچھ دیگر خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہیں اور عورت کی ہر خوبی کے قدموں میں حسن کی ہزار ہا بہاریں قربان کی جا سکتی ہیں۔

میاں محمد بخشؒ بھی فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں حسن کی لاکھوں اقسام ہیں جسے وہ حسن کی بہاریں کہتے ہیں۔ عارف کھڑیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب بہاریں عارضی اور بے معنی ہیں اور سب کی سب پیوند خاک ہو جائینگی مگر اے طالب تو ایسی پریت لگا کہ دنیا تیری محبت کے گیت گائے اور تیرے بعد تیری پریم کہانی ہمیشہ زندہ رہے۔

یہ خوبیاں کیا ہیں؟۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ یہ تمہارا ڈیپارٹمنٹ نہیں۔۔۔ یہ خاص الخاص اور انتہائی نازک معاملات ہیں جسے ہر ایرے غیرے کے سامنے بیان کرنا صنف نازک کی توہین ہے۔۔۔ مگر یہ خوبیاں صرف مشرق میں ہی پائی جاتی ہیں مغرب میں نہیں۔۔۔ کیوں مغرب میں عورتیں نہیں رہتیں۔۔۔ میں نے پوچھا؟۔۔۔ رہتی ہیں۔۔۔ مگر انہیں حسن اور نسوانیت کا احساس نہیں رہا۔۔۔ مغربی عورت۔۔۔ خیر اب مشرقی بھی۔۔۔ ہاں مغرب کی عورت۔۔۔ عورت نہیں فی میل ہے۔ یعنی مادی ہے اور وہ اپنی مادیت کو انجوائے کرتی ہے۔۔۔ اپنے حسن اور جسم کو کیش کراتی ہے اور پھر تھک ہار کر کسی آخری نر سے شادی کا بندھن باندھ لیتی ہے تا کہ بڑھاپے میں گپ شپ والا کوئی بندہ ساتھ ہو مگر مشرق میں یہ رواج ابھی عام نہیں ہوا۔ یہاں یہ رواج اپر اور سپر کلاس میں ہے۔۔۔ وہ کیسے میں نے پوچھا۔۔۔ تم نے سنا نہیں کہ فلاں عورت پہلے فلاں بیوروکریٹ کی بیوی ہوتی تھی۔ پھر وہ فلاں سیاستدان کی مرسڈیز میں گھومنے لگی اور پھر وہاں سے فلاں کارخانہ دار کے ساتھ یورپ چلی گئی اور آج کل فلاں وزیر یا پھر سمگلر کی بیوی ہے۔۔۔ یہ سب سپر اور اپر کلاس کی باتیں ہیں جبکہ یورپ میں یہ عیاشی عام آدمی بھی کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مکمل روشن خیالی آنے تک ہمارے عام آدمی کو یورپ کے عام آدمی والی زندگی کا انتظار کرنا پڑیگا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ عام آدمی لٹ جائے گا۔۔۔ اس کی غیرت کا رہا سہا جنازہ بھی نکل جائے گا۔۔۔ جیسے مختاراں مائی پہلے لٹی اور اب اپنا جنازہ لیکر ملکو ملک پھر رہی ہے اور کہتی ہے دیکھو میں ہوں مختاراں مائی آف پاکستان جو پہلے لٹی اور اب پٹ رہی ہے مگر خوش ہے۔۔۔ بہت خوش۔۔۔ مگر سارے غریب اس طرح خوش نہیں ہونگے۔۔۔ پھر کیا ہوگا۔۔۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ گلی گلی محلے محلے جنازے اٹھینگے۔۔۔ قتل ہونگے۔۔۔ بدلے لیے جائیں گے۔۔۔ اغوا ہونگے۔۔۔ آگیں لگیں گی۔۔۔ برادریاں برادریوں پر حملہ آور ہونگی۔۔۔ بیوٹی پارلر جہاں پولیس اور ایکسائز انسپکٹر دھندہ کرواتے ہیں بھڑک اٹھیں گے۔۔۔ بہت خون بہے گا۔۔۔ بہت سے غریبوں کا خون۔۔۔ دیکھو جب تک خون نہیں بہے گا ہم منزل کی طرف نہیں جائیں گے۔۔۔ منزل کا تعین خون کی سرخ لکیر کرتی ہے پکی سڑک، ریل کی پٹڑی، ہوا کے دوش اڑتا جہاز یا سمندر میں تیرتا بیڑہ نہیں۔۔۔ آزاد و خود مختار اور ترقی یافتہ ملکوں کی حدیں قبرستانوں سے شروع ہوتی ہیں جہاں سنڈے کے سنڈے لوگ پھول چڑھانے آتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کسی کو نانی یا دادی کا نام بھی نہیں آتا۔ ان کی تاریخ ماں اور محبوبہ تک محدود ہے

اور وہ لوگ صرف مدر ڈے اور ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں مگر انہیں ہر بندرگاہ پر موجود وسیع وعریض قبرستانوں کی تاریخ کا پتہ ہے جہاں ان کے ہیروز نے اپنا خون بہایا اور وطن کی سلامتی کیلئے جان دی۔ گمنام سپاہی ہی ان کے ہیرو ہیں۔ ہمارے ہیرو جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب انہوں نے بھی باہم معاہدہ کرلیا ہے کہ آئندہ ملکر کھائیں گے جبکہ واشنگٹن والے بابے کو بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جو کام تم وردی والے سے لے رہے ہو وہ ہم وردی کے بغیر اور اس سے بہتر کرنے کو تیار ہیں۔ اب صرف بابا جی کے حکم کا انتظار ہے۔ جونہی واشنگٹن والی سرکار کو یقین ہوگیا کہ شلوار قمیض والے وردی والے سے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو ہمارے جلاوطن ہیرو واپس آجائینگے اور اپنا کام شروع کردیں گے۔۔۔ وردی والے کدھر جائینگے۔۔۔ میں نے قریب ہوکر آہستہ سے پوچھا۔۔۔ وردی کا کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ وردی والے اکثر شہید ہوجاتے ہیں یا پھر زندگی ہو تو ریٹائیر ہوکر کنیڈا، امریکہ یا برطانیہ بھی جاسکتے ہیں۔۔۔ وہاں کئی سو ایکڑ پر مشتمل ائیر مارشل انور شمیم کا ایک ماڈل فارم ہے جہاں وہ اپنے ذاتی جہاز اڑاتا ہے۔۔۔ وہاں ہی انور شمیم کے پڑوس میں ایک اور فارم بھی لیا جاسکتا ہے۔۔۔ اچھا چھوڑو ہنی۔۔۔ تم صائمہ کے متعلق بتارہی تھیں۔

ہاں! صائمہ ایک واجبی سی قبول صورت لڑکی ہے مگر اس کے اندر کی لڑکی اور اسے چاہنے والے لڑکے اکسا رہے ہیں کہ وہ اعلان کرے کہ وہ واجبی سی لڑکی نہیں بلکہ بدیع الجمال ہے جس کے حسن سے دنیا آگاہ ہی نہیں۔ اگر وہ ایک جھلک دکھلا دے تو دنیا بھر کی حسینائیں اس کی غلامی پر فخر کریں اور زمین پر کئیں حسینا عالم کے انتخاب کے لئے مصنوعی حسیناؤں کا بیہودہ میلہ نہ لگے۔۔۔ عورتیں ننگی ہوکر خوبصورتی کا پرچار نہ کریں چونکہ ان ننگی نمائشی عورتوں سے ہزار گنا خوبصورت اور حسین عورتیں گھروں میں رہتی ہیں جن کے حسن سے کائنات میں رنگ ہے۔ ان کے بطن سے نیک چلن اور خوبصورت مرد اور عورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی ہی کچھ عورتوں نے پیغمبر، ولیؔ، شہید، غازی، رشی، اور اوتار جنے جنہوں نے مخلوق کو خالق سے متعارف کروایا تاکہ انسان اور حیوان میں واضح فرق کا احساس ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر کیا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ حیوانوں نے اس فرق کو تسلیم کیا اور انسان کی زندگی سے علیحدہ اپنی بستیاں بسائیں۔ انہوں نے انسانوں سے کئے گئے معاہدے کا احترام کیا اور کبھی انسان بننے کی کوشش نہ کی مگر انسانوں نے کبھی اس معاہدے کا احترام نہ کیا اور ہمیشہ حیوانیت اختیار کی اور ایسے ایسے کام کیئے کہ حیوان بھی اس پر شرمندہ ہوئے اور انسانوں کی بستیوں سے دور ہوتے گئے۔۔۔ جوں جوں انسان کی حیوانیت ترقی کرتی گئی حیوانوں کی نسلیں مٹتی گئیں چونکہ انہیں انسان نما حیوانوں کی حیوانیت اور درندگی نے مرمٹنے پر مجبور کردیا۔۔۔ آج اس دنیا میں اربوں انسان موجود ہیں مگر شیر، چیتے، لگڑ بگڑ، ہاتھی، گینڈے اور پانڈے صرف گنتی کے رہ گئے ہیں۔۔۔ یہی حال عقابوں، جروں اور شکروں کا ہے جبکہ بھارت میں پارسیوں کو کھانے کے لئے اب گدھ بھی باقی نہیں رہے۔۔۔ پارسی دنیا میں جہاں بھی مرتا ہے اسے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی بھیج دیا جاتا ہے جہاں ٹاور آف سائیلنس کے اردگرد ہزاروں گدھ موجود رہتے ہیں۔۔۔ ہنی اگر کسی دن پارسی کی میت نہ آئے تو؟۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ نہ آئے۔۔۔ کراچی کے گدھوں کا وہاں کے لیڈروں سے بھی ایک معاہدہ ہے۔۔۔ کیسا معاہدہ۔۔۔ دیکھو بھائی۔۔۔ ہنی بولی۔۔۔ پارسی کی ڈیڈ باڈی نہ آئے تو معاہدے کے تحت لندن سے فون آجاتا ہے کہ آج اتنے انسانوں کو نہلا دو۔۔۔ پھر۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ بس گدھوں کی مناسب خوراک کیلئے مطلوبہ انسانوں کو نہلا دیا جاتا ہے تاکہ گدھوں اور لیڈروں کے درمیان ہونے والے معاہدے کو کم ازکم کراچی کی حدتک مثالی بنایا جاسکے اور حیوان انسانوں کو طعنے دینے سے باز رہیں کہ وہ حیوانیت کے احترام سے کنی کترا رہے ہیں۔

کیا مرکزی حکومت کو اور اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے بڑوں کو گدھوں اور لیڈروں کے درمیان ہونے والے اس معاہدے کا پتہ ہے؟؟ میں نے ہنی سے پوچھا۔۔۔ ہاں بلکل پتہ ہے ایجنسیوں والے بتاتے رہتے ہیں جیسے جنرل انور کے حکم کے تحت آزاد کشمیر پولیس کو ایک سابق فوجی کو توہین عدالت کے نہ کردہ جرم میں گرفتار کرکے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اب بھی جج صاحبان فوجی کو مارنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ ایجنسی والوں نے اس کی اطلاع بڑے لیڈروں کو دی تھی مگر کسی نے جنرل انور اور جج صاحبان سے نہیں پوچھا کہ اصل مجرم کو کیوں نہیں پکڑتے جس نے یہ سازش کی ہے۔۔۔ پھر پوچھیں بھی کیوں؟ پاکستان میں ایسا رواج نہیں یہ سب ولائت میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں کا حق ہے کہ وہ کمزور لوگوں کو اغواٗ کریں اور قتل کروائیں۔ انسانی حقوق والے بھی اس پر آنکھیں بند رکھتے ہیں انہیں صرف مختاراں مائی میں دلچسپی ہے باقی لوگ ان کے نزدیک بھی انسان نہیں کیونکہ اس پر انٹرنیشنل میڈیا متحرک نہیں ہوتا۔۔۔ مرکز نے کراچی کے لیڈروں سے بھی معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ جتنے بندوں کو چاہئیں غسل دیں۔۔۔ گدھوں سے معاہدہ کریں یا مچھلیوں کو خوراک پہنچائیں مگر بوری بند لاش کہیں نہیں ملنی چاہیے چونکہ اس سے حقوق انسانی کی تذلیل ہوتی ہے اور ملک بدنام ہوتا ہے۔۔۔ مرکز اور صوبے کے درمیان ایک انڈرسٹینڈنگ ہے جس کے مطابق سب کچھ درست جارہا ہے جو شہر کے امن، خوشحالی اور ترقیاتی کاموں کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ہم صائمہ کی بات کررہے تھے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک دن صائمہ نے کہا کہ اگر میں سارے شہر کا پیدل چکر لگاؤں تو اس شہر کی تمام لڑکیاں اور عورتیں میری خوبصورتی پر ایمان لے آئیں، شہر کے سارے بیوٹی پارلر بند ہوجائیں اور میرے گھر کے باہر عورتوں کی فوج میرے حکم سے حاکم وقت کو مجبور کردے کہ وہ اٹھارویں آئینی ترمیم لاکر ملک میں عدلیہ، پولیس اور ضلعی حکومتوں کے نظام میں میری مرضی کے مطابق تبدیلیاں لاکر ملک کو ایک حقیقی اسلامی فلاحی ریاست بنا

دے۔۔۔کیوں۔۔۔حاکم وقت کو اس بات کا پتہ نہیں کہ وہ صائمہ کے مجبور کرنے پر ہی یہ سب کریگا۔۔۔پتہ ہے مگر آج کل اسے چوہدریوں اور چینی چوروں نے مجبور کیا ہوا ہے۔چوہدریوں نے چینی، سیمنٹ، تیل، آٹے، لوہے اور پیپسی کولے والوں کو بھی ساتھ ملا لیا ہے اور حاکم وقت کو یرغمال بنا رکھا ہے۔حاکم وقت بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔اسے لوگوں کے دکھ درد کا احساس بھی تھا مگر واشنگٹن والے بابے نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ چوہدریوں اور چینی والوں سے دوستی پر مجبور ہوگیا۔۔۔کیوں؟۔۔۔واشنگٹن والے بابے کی دوستی صرف پیپسی کولے اور ڈیزائنر سوٹ پہننے والے بابو سے تو تھی۔۔۔دراصل واشنگٹن والے بابے نے حاکم وقت کو بلکل دیوار سے لگا دیا اور اس کی ڈیمانڈیں اس قدر بڑھنے لگیں کہ مجبوراً حاکم کو چوہدریوں کو ساتھ ملانا پڑا تو چوہدریوں نے حاکم کے اردگرد کوئی ایسا درخت اور پتھر نہ چھوڑا جس پر اپنا بندہ نہ بٹھا دیا ہو۔۔۔تخت لاہور پر جہاں کبھی رنجیت سنگھ بیٹھ کر کابل اور کشمیر تک حکمرانی کرتا تھا وہاں چھوٹا چوہدری خود بیٹھ گیا اور لاہور کو جلالپور جٹاں بنا دیا۔حاکم کا مشیر خاص برائے فوجی امور ایک ریٹائیرڈ چوہدری جرنیل ہے جبکہ قومی سلامتی کا مشیر ہے ہی جلالپور جٹاں کا چوہدری۔۔۔اب حاکم وقت کے پاس کوئی ایسا محکمہ نہیں بچا جہاں چوہدریوں کے بندوں کے علاوہ کوئی دوسرا بیٹھ سکے اور حاکم کو اس کی رعایا کی بدحالی کا صحیح اور سچا حال بیان کرے۔ایوان صدر کی موجودہ حالت چانکیا کے سنہری اصولوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ہند کے عظیم سیاسی مفکر چانکیا کوتلیا نے حکمرانی کے اصولوں کے باب میں لکھا ہے کہ ایک خاندان ایک برادری ایک گھر اور ایک گھرانے کے افراد اگر بادشاہ کے محل میں تعینات ہو جائیں تو سمجھو کہ بادشاہ کے زوال کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔لہٰذا ملکہ کو چاہئے کہ وہ شاہی محل کے امور کو اپنے ہاتھ میں لے اور اس طرح کے لوگوں سے شاہی محل کو پاک رکھے۔چوہدریوں کے پولیٹیکل ویژن کے مطابق پاکستان کا کل رقبہ چوہدری ظہور الٰہی روڈ لاہور سے لیکر نت ہاؤس گجرات تک محدود ہے جبکہ اس سلطنت کے اردگرد کچھ جزیرے ہیں جن میں اٹک، میانوالی، سرگودھا اور پھالیہ کے کچھ گاؤں شامل ہیں جہاں امن، خوشحالی اور ترقی بام عروج پر ہے۔۔۔چوہدریوں کے پولیٹیکل ویژن پر صائمہ کو پریشانی لاحق ہے اور اس کے خیال میں اگر حاکم وقت کو چوہدریوں کے چنگل سے آزادی نہ مل سکی تو دہلی کا سیدزادہ چوہدری چوہدری کرتے آپے چوہدری ہوگیا تو چوہدریوں کا تو کچھ نہیں جائے گا مگر حاکم کی حاکمیت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔صائمہ چاہتی ہے کہ حاکم اپنے اصل مقصد کی طرف دھیان دے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک کے اندرونی مسائل کے حل کی طرف متوجہ ہو۔صائمہ کے پاس قومی سلامتی اور ملکی ترقی کے بہت سے منصوبے ہیں جنہیں اس نے سارے ملک کے شہروں، دیہاتوں، قصبوں، جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، ساحلوں اور دریاؤں کے مشاہدے کے بعد قلمبند کیا ہے۔صائمہ کا دعویٰ ہے کہ ہمارے نام نہاد ماہرین جو منصوبے پیش کرتے ہیں وہ قابل عمل نہیں چونکہ ان منصوبوں کا مقصد پیسہ ہضم کرنا، قوم کو دھوکہ دینا اور غیر ممالک سے قرضے حاصل کر کے قوم کو مقروض اور مفلوک الحال بنانا ہے۔

صائمہ کہتی ہے کہ اس کے تیار کردہ منصوبے پاکستان کی خالص مٹی اور اس پر بسنے والے انسانوں کی ضرورت اور خواہش کے مطابق ہیں جبکہ نام نہاد امریکہ اور یورپ پلٹ ماہرین کے پیش کردہ منصوبے امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے طلباً کے وہ ریسرچ پیپر ہیں جنہیں فرسودہ سمجھ کر پھینک دیا گیا اور ہمارے یہ نقال ان فرسودہ ریسرچ پیپروں کے پلندے اٹھالائے اور اب باری باری ان فرسودہ منصوبوں کو پاکستانی قوم پر آزما کر اسے اہل مغرب کا غلام بنانے کی سازش پر عمل پیرا ہیں۔صائمہ کا اپنا سیاسی، سماجی اور معاشی ویژن ہے مگر حاکم وقت تک اس کی رسائی نہیں۔۔۔وہ انٹرنیٹ پر جاسکتی ہے۔۔۔میں نے سوال کیا۔۔۔ہاں جاتو سکتی ہے مگر حاکم وقت کو حیوانوں میں کتے اور مردوں میں جارج بش جونیئر اور عورتوں میں رانی مکرجی پسند ہیں۔۔۔وہاں صائمہ کی گنجائش نہیں۔۔۔سنا ہے وہ انٹرنیٹ پر ان تینوں کو ہی دیکھتے ہیں جبکہ اخبار پڑھنے کا انہیں شوق نہیں۔باقی وقت بیوروکریٹ چوہدری انہیں تاش کے پتوں میں الجھائے رکھتا ہے اور نئے نئے آئیڈیاز پیش کر کے حاکم وقت سمیت ساری قوم کو کنفیوژ کر رہا ہے۔جلالپور جٹاں والے جلالی چوہدری نے کشمیر کی پرائیوٹائیزیشن کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے اور خفیہ ڈپلومیسی کے ذریعے کشمیر کا سودا بھی کروا رہا ہے مگر کمیشن کم ہونے کی وجہ سے کشمیریوں کا صحیح ریٹ نہیں مل رہا۔اس مقصد کیلئے بیرسٹر سلطان محمود اور جنرل انور کو ساتھ ملانے کیلئے آزاد کشمیر پیپلز مسلم لیگ بنادی گئی ہے اب دیکھئے جاٹ سدھن اتحاد کی برکت سے کشمیریوں کا کیا بھاؤ لگتا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ حاکم وقت کو ای میل بھیجنا فضول ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔فضول بلکہ بے فضول۔۔۔ہاں۔۔۔اگر صائمہ اپنے آئیڈیاز رانی مکرجی کو بجھوادے اور اس کے پاس وقت ہو تو ہوسکتا ہے وہ کسی خیر سگالی دورے کے دوران ان آئیڈیاز سمیت صائمہ کو حاکم اعلیٰ کے سامنے پیش کر دے مگر یہ ممکن نہیں۔۔۔ممکن نہیں؟۔۔۔کیوں نہیں؟۔۔۔اس لئے کہ ریما، شیخ رشید، فریال گوہر اور کئی دوسری پارٹیاں ایسا نہیں ہونے دیں گی۔۔۔ایک اور طریقہ بھی ہے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔وہ کیا۔۔۔ہنی بولی۔۔۔وہ یہ منصوبے دانیال عزیز کو دے دے۔۔۔یہ اور بھی ناممکن ہے۔۔۔ہنی بیگم نے کہا۔۔۔دانیال عزیز کا تعلق چوہدریوں کے دوسرے قبیلے سے ہے جو بظاہر تو پہلے چوہدریوں کے اتحادی ہیں مگر اندر واندر میلوں کا فیصلہ ہے۔۔۔دیکھو یہ دو پنجابی فلمیں ہیں جن کا پروڈیوسر ایک ہے۔۔۔ایک کا نام جٹ دا کھڑاک اور دوسری کا گجر داویر ہے اور دونوں ایک ہی سینما میں چل رہی ہیں۔اب اتنے شور میں صائمہ کی کون سنے گا ہنی نے جواب دیا۔ویسے بھی دانیال عزیز کوئی ایسا قابل کار ذہن نہیں کہ اسے اتنے سچے اور اوریجنل آئیڈیاز دیکر پولیس اور ضلعی حکومتوں کے نظام کی طرح ان وچاروں کا بیڑہ غرق کیا جائے۔

اچھا چھوڑو ہنی۔۔۔ یہ بتاؤ اگر صائمہ خوبصورت بھی نہیں تو وہ حسیناؤں کو چیلنج کیسے کرسکتی ہے۔۔۔تم یہ بھی کہتی ہو کہ وہ حسن کے بغیر عشق کا دریا عبور کرنا چاہتی ہے۔جبکہ اس دریا میں کودنے کیلئے حسن لازمہ ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔میں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ عورت کے اندر ایسی خوبیاں موجود ہیں جو حسن سے بڑھ کر حسین ہیں اور صائمہ بہت سی خوبیوں پر کام کررہی ہے جس کی وجہ سے یونیورسٹی کے دس لڑکے جبکہ مختلف سکولوں کالجوں سے بھاگے ہوئے چار لڑکے، دو شادی شدہ مرد اور تین پینڈو جوان صائمہ کو دل میں بسائے آئیں بھرتے ہیں مگر صائمہ فی الحال کسی ایک میں بھی سیریس نہیں۔۔۔اس طرح تو ان بیشمار لوگوں میں جنگ کا خطرہ ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ کوئی خطرہ نہیں۔۔۔صائمہ کو اور پروفیسر اللہ لوک کو بھی پتہ ہے کہ سوائے پینڈو دلڑکوں کے باقی سب کی دو دو گرل فرینڈز ہیں۔۔۔وہ ان سے فارغ ہوتے ہیں تو صائمہ کو بھی فون کردیتے ہیں اور یہی حال صائمہ کا ہے۔۔۔وہ بھی اکثر فارغ نہیں ہوتی۔۔۔کسی کو چائے پر، کسی کو کھانے پر، کسی کو لائبریری میں۔۔۔کسی کو کدھر کسی کو کدھر ملتے ملاتے شام ہوجاتی ہے اور اوپر سے کئی موضوعات پر بیک وقت تحقیق بھی کررہی ہے۔ یہ کوئی آسان کام تو نہیں دراصل یہ بیس پچیس عاشق بھی صائمہ کی تحقیق ہی کا حصہ ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ غریب کے عشق اور امیر کے عشق کا کیا معیار ہے۔ مرسڈیز اور رکشہ میں آنے والے محبوب کے دل و دماغ پر محبت کی شعاعیں کس طرح عمل کرتی ہیں۔ دونوں طبقات جدائی اور قربت کے لمحات میں کیسے ری ایکٹ کرتے ہیں۔ کیا ان کا عشق مجازی عشق حقیقی کی پہلی منزل ہے یا پھر یہ وقت گزاری اور تفریح کا محض ایک بہانہ ہے۔ صائمہ کو پتہ ہے کہ عشق کی پہلی اور آخری منزل کیا ہے چونکہ یہ بھی اس کی ریسرچ کا حصہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ عاشق جس بھی منزل اور مرتبے کا طالب ہو وہ بنیادی طور پر صابر اور صادق ہوتا ہے اور جو شخص صابر اور صادق نہ ہو وہ عاشق نہیں ہوسکتا۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ پانچ وقت کے نمازی اور تہجد گزار عاشق پر اللہ کتنا مہربان ہے اور گاؤں سے ہر روز پیدل چل کر شہر آنے والے محبوب کے قدم لڑکھڑاتے ہیں یا دن بدن اس میں استحکام بڑھ رہا ہے۔

وہ دیکھ رہی ہے کہ مڈل کلاس اور اپر کلاس کے لڑکے ایک دوسرے پر بازی لیجانے میں کس عمل سے گزرتے ہیں۔۔۔سپر کلاس کے نو دولتیوں میں آداب واحترام کا کیا معیار ہے۔۔۔جسمانی اور روحانی قربت کا احساس سوسائیٹی کے کس درجے میں اور کس مقدار میں ہے۔۔۔کن گھروں میں اچھی مائیں ہیں جنہوں نے اولاد پر توجہ دی اور کن ماؤں نے نر اور مادی کے ملاپ پر انحصار کیا اور بچوں کی تربیت پر غور ہی نہیں کیا۔۔۔۔

وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کے فریہ فریم میں کس کلاس کا لڑکا یا مرد فٹ آتا ہے۔۔۔وہ جھوٹ، فراڈ، فریب اور فرسودہ روایات کو جنم دینے والی ماؤں کے لاڈلوں کی پرکھ کررہی ہے۔۔۔۔دیکھو دوست۔۔۔ہنی بولی۔۔۔صائمہ کہتی ہے کہ وہ مستقبل کی ماں ہے جبکہ اس کا چاہنے والا مستقبل کا معمار ہونا چاہیے۔۔۔وہ کہتی ہے کہ میں زمین ہوں اور میرے چاہنے والے بیج۔۔۔مگر حاکم وقت کو احساس ہی نہیں کہ زمینیں بنجر ہورہی ہیں اور بیجوں میں درخت بننے کی قوت ختم ہورہی ہے۔۔۔سنا ہے کہ وہ کالا باغ اور بھاشا ڈیم بنارہا ہے مگر اسے احساس ہی نہیں کہ پتھر کو پانی میں بھگونے سے کھیت نہیں لہلہاتے اور نہ ہی بیکار بیج پانی میں ڈالنے سے فصلیں اُگتی ہیں۔

(۵)

صائمہ کن موضوعات پر تحقیق کر رہی ہے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔اس نے ایک ہی وقت میں کئی موضوعات اپنے دستر خوان پر سجا رکھے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ کنفیوژن کا شکار ہو رہی ہے۔۔۔ یہ صائمہ ہی نہیں بلکہ پروفیسر اللہ لوک اور پاکستان کے ہر سنجیدہ اور محبّ وطن شہری کا مسئلہ ہے۔ڈاکٹر جاوید غامدی، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر مہدی حسن، نذیر ناجی، منوں بھائی، پرویز ھود بھائی، جاوید چوہدری، حامد میر، سلیم صافی، نجم سیٹھی، انصار عباسی، امتیاز عالم اوران کے قبیلے کے دانشوروں اور مفکروں کے علاوہ ہر شخص پریشان ہے۔۔۔کیوں؟۔۔۔یہ ٹولہ محبّ وطن نہیں کیا؟۔۔۔محبّ وطن تو ہیں مگر وہ وطن میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بے وطن تصور کرتے ہیں۔۔۔ان لوگوں کے نزدیک وطن کا وہ تصور نہیں جو پاکستان کے دیسی قلمکاروں، دانشوروں اور وطن دوستوں کا ہے۔۔۔بشریٰ رحمٰن بھی تو وطن دوست ہے۔۔۔میں نے ہنی بیگم سے پوچھا۔۔۔نہیں وہ وطن دوست نہیں حکومت دوست ہے جبکہ طیبہ ضیاء چیمہ امریکن فقیرنی صرف شریف خاندان کی دوست ہے اور پاک فوج کی اتنی ہی مخالف ہے جتنا شریف خاندان اور بھارت ہے۔۔۔ یہ سب لوگ پریشان اور کنفیوژ کیوں ہیں۔ میں نے پوچھا۔۔۔صائمہ کی طرح ان کے پاس بھی موضوعات کی بھیڑ ہے اور اس بھیڑ میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔۔۔دہشت گردی، امریکی بلیک میلنگ، بھارتی سازشیں، افغانستان کی طرف سے دھمکیاں، مولانا فضل الرحمان، محمود اچکزئی، ایم کیو ایم کے مسائل، بلوچستان اور وزیرستان میں جاری جنگ، مہنگائی، غربت، عوامی بے چینی مافیا کا حکومتی کنٹرول اور عوام دشمن کاروائیوں اور میثاق جمہوریت سمیت سینکڑوں مسائل ہیں جن پر لکھنا اور رائے دینا اب کسی کے بس میں نہیں رہا۔۔۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عوام کی طرح قلمکار اور دانشور بھی اب تھک ہار کر حکمرانوں اور سیاستدانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے ہیں۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ہاں۔۔۔ایسے ہی لگتا ہے۔۔۔ویسے اگر یہ لوگ لکھتے بھی رہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔حکومت ان کے لکھے کو اہمیت نہیں دیتی اور عوام کی حالت اس تھکے ماندے قافلے کی طرح ہے جو سمندر اور صحرا کے درمیان خیمہ زن ہے جنہیں الفاظ کی نہیں پانی اور خوراک کی ضرورت ہے۔۔۔ ہوسکتا ہے صاف شفاف اور غیر جانبدار الیکشنوں کے بعد کھانے پینے، رہنے سہنے اور اوڑنے بچھونے کی چیزوں میں پچاس فیصد کمی ہو جائے۔۔۔تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے۔۔۔ہنی بیگم نے پوچھا۔۔۔جنرل صاحب نے بیان دیا ہے اور ان کے بیان کی کچھ تو اہمیت ہے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں تمہارے نزدیک اہمیت ہے مگر صائمہ نہیں مانتی۔وہ کہتی ہے وزن دار بیان اب چوہدریوں کا ہے۔ویسے بھی صائمہ جنرل مشرف کے دور حکومت کو بینظیر کا تیسرا اور فضل الرحمٰن کا پہلا دور حکومت کہتی ہے۔ جہاں تک صاف شفاف اور غیر جانبدار الیکشنوں کا تعلق ہے تو اس کی ریہرسل آزاد کشمیر میں کی جارہی ہے۔ جہاں پیسے، گنڈاسے اور برادری ازم کی قوت کا عنقریب مظاہرہ ہونے والا ہے۔۔۔مگر تم صائمہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو۔۔۔وہ تو ابھی سند یافتہ محقق بھی نہیں محض طالبہ ہے۔۔۔اس کے افکار و خیالات کی مثال دینا اہل فکر و دانش کی فکریت اور دانشوری کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔نہیں یہ تمہاری کم عقلی ہے۔۔۔ہنی نے جواب دیا۔۔۔دانشوری کیلئے یونیورسٹی کی سند کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ڈاکٹر شاہد مسعود، خلیل ملک، انیق ناجی، طلعت حسین اور قطرینہ حسین بھی تو محقق اور دانشور ہیں۔۔۔ دیکھو بھیا۔۔۔اللہ کمپیوٹر والے کا بھلا کرے اس پر سب کچھ لکھا لکھایا ملتا ہے۔۔۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ دانشوروں کی دانشوری بیچ کر کھا رہے ہیں۔۔۔تم کسی بھی موضوع پر کمپیوٹر کا بٹن دباؤ تمہیں لاکھوں صفحات پر مشتمل معلومات مل جائینگی۔آپ چاہیں تو اسے کتاب بنا کر بیچ دیں، چاہیں تو ٹی وی پر کچھ لوگوں کو بلا کر اس پر بحث مباحثہ کروالیں یا پھر ہر روز اخبار میں ایک کالم چھپوالیں۔اب تو زبان کا بھی مسئلہ نہیں رہا۔ ہر زبان کا سافٹ ویئر مارکیٹ میں ملتا ہے۔آج کل دانشوری جمعہ اور اتوار بازار میں بھی ملتی ہے۔۔۔صائمہ بتا رہی تھی اب دس روپے فی تھالی کے حساب سے بکتی ہے۔۔۔اس بھاؤ تو دو روٹیاں اور پانچ پکوڑے بھی نہیں ملتے۔۔۔اللہ بھلا کرے واشنگٹن والے شوکت بابو کا۔ جب وہ آئے تھے تو روٹی دو روپے کی تھی اب چھ روپے کی ہوگئی ہے اور پکوڑے ستر روپے کلو۔۔۔صرف دانشوری اور تحقیق کی تھالی دس روپے کی ہے۔۔۔کونسی تھالی۔۔۔ یہ دانشوری ہے یا دال چاول۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔کمپیوٹر میں ڈالنے والی چھوٹی سی سفید تھالی۔۔۔صائمہ غصے اور حقارت سے اسے تھالی کہتی ہے۔۔۔اچھا تم سی ڈی کو تھالی کہتی ہو۔۔۔میں نہیں صائمہ کہتی ہے۔۔۔اس کی ایک سہیلی ہے شائد ثانیہ نام ہے اس نے بتایا ہے کہ ٹیلیویژن والے دانشوروں کے پاس ہر موضوع کی ایک تھالی موجود ہے۔ وہ اسے کمپیوٹر میں ڈال کر پندرہ بیس منٹوں میں پروگرام تیار کر لیتے ہیں۔۔۔ ہاں ہنی۔۔۔صائمہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔۔۔شائد اسی وجہ سے ان لوگوں کی باتیں بے اثر ہیں۔ ورنہ آج تک انہوں نے کسی حکومت، عدالت، سیاستدان، کسی جرنیل یا کارخانہ دار اور سرمایہ دار کے ستائے ہوئے شخص کا انٹرویو نہیں کیا اور نہ ہی کسی مظلوم اور محکوم کو اپنے چینل پر بلا کر اس کے دکھ درد، مصیبت اور پریشانی سے اس کے اصل حاکم اور آقا بابا جی سرکار واشنگٹن والے کو آگاہ کیا

ہے۔۔۔ یہ لوگ جنرل مشرف کی شکائتیں نواز شریف بینظیر اور فضل الرحمٰن سے کرتے ہیں اور نواز شریف اور بینظیر کی کوتاہیوں اور فضل الرحمٰن کی چابکدستیوں اور کہہ مکرنیوں پر شیخ رشید، چوہدری شجاعت اور حکمران جماعت کے وزیروں سے تبصرہ کرواتے ہیں۔۔۔عدالتوں، تھانوں، پٹوار خانوں اور عوام کا بھرکس نکالنے والے اونچے ایوانوں میں کیا ہورہا ہے۔ ہمارے ان دس روپے فی تھالی والے دانشوروں اور محققوں کو اس سے غرض نہیں۔ صائمہ کہتی ہے کہ غربت، استحصال، جہالت، کسمپرسی، ظلم، زیادتی اور بے انصافی پر مبنی سافٹ ویئر کی تھالی ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی ورنہ ہمارے حکمران اتنے بے حس نہ ہوتے۔۔۔ صائمہ کو پاکستانی جمہوریت پر بھی اعتراض ہے بلکہ اس کے نزدیک پاکستان میں جمہوریت آمریت سے بدر جہا بدتر ہوتی ہے۔ یہ کونسی جمہوریت ہے جس میں ملک کے چھٹے ہوئے، لفنگے، نودولتیے، سمگلر، غنڈے، قاتل، لٹیرے اور چھچھوڑے اسمبلیوں میں بیٹھ کر قانون سازی اور عوام پر حکمرانی کریں۔۔۔ پاکستان میں صرف عمران خان اور مسرت شاہین کی پارٹیاں ہیں جو مافیا سے پاک ہیں۔ اب تو محترمہ مسرت شاہین بھی فنافی طاہر القادری ہوگئیں ہیں اور اپنی پارٹی سمیت منہاج الطاہری میں سما کر شاہین سے طاہر التحریک بن گئیں ہیں۔ ویسے تو محترمہ مسرت شاہین اور مولانا فضل الرحمٰن میں سیاسی رقابت ہے مگر مولانا احترام نسواں کے داعی کی حیثیت سے مسرت شاہین کیلئے اپنے قوی جثّہ میں ایک نرم حصہ بھی رکھتے تھے۔ جب سے محترمہ مسرت شاہین منہاجن ہوئیں مولانا کچھ اپ سیٹ رہنے لگے شائد اسی لیے انہوں نے بھارت یاترا سے پہلے بیان دیا کہ ایشوریا رائے کون ہے وہ اس خاتون کو نہیں جانتے۔۔۔ شائد نہ جانتے ہوں۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں نہ جانتے ہوں؟؟؟ اور وہ بھی مولانا فضل الرحمٰن۔۔۔ اللہ کے فضل سے وہ سب جانتے ہیں مگر جب سے محترمہ شاہینہ جمیل نے ان کے ٹکٹ پر سینٹ کا الیکشن لڑا ہے ان کے دل میں مسرت شاہین کی کمی پوری ہوگئی ہے۔۔۔ وہ شاہین کو تو پارٹی میں داخل نہ کرسکے مگر شاہینہ کی آمد کی خوشی میں ہزاروں ایشوریاں قربان کردی گئیں۔۔۔ مولانا کو پتہ ہے کہ ایشوریا رائے کو ہندوٴ جوتشیوں اور جوگیوں نے منحوس قرار دیا ہے۔ ایشوریا نے عمران خان پر دل پھینکا تو ان کا گھر ویران ہوگیا، عمران خان کے بعد سلیمان خان بھی بدحال ہوئے اور ابھی تک ان کا ستارہ گردش میں ہے۔ مولانا کو پتہ چل گیا ہے کہ ایشوریا پٹھانوں پر بھاری ہے۔ چاہے وہ مولوی ہوا یکٹر ہو یا کرکٹر۔۔۔ مولانا اصلی مولانا ہیں انہوں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔۔۔ مولانا کو جنرل مشرف کی مجبوریوں کا بھی پتہ ہے۔۔۔ اگر محترمہ بینظیر مشرف بہ آرمی ہاوٴس نہ ہوئی تو جنرل صاحب کے پاس صرف مولانا والا آپشن باقی رہ جائے گا۔۔۔ اب اگر مشرف مولانا اتحاد ہوتا ہے جس کا ہونا کافی حد تک یقینی ہے تو ہمارے اگلے وزیراعظم بھی مولانا ہی ہونگے۔ اس لئے وہ نہیں چاہینگے کہ ان کی وزارت عظمیٰ پر ایشوریا کی نحوست کا سائیہ پڑے۔۔۔

ایشوریا کی نحوست ڈھکی چھپی نہیں۔ ایشوریا کی دعوت پر بھارت کا دورہ طویل کرنے کے خواہش مند مخدوم امین فہیم پہلے ہی وزارت عظمیٰ سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اب ایشوریا کے ٹھمکے کی خاطر مولانا اپنی وزارت عظمیٰ کا چانس گنوانے سے رہے۔۔۔ مولانا مشرف اتحاد کی بلوچستان میں کامیاب ریہرسل ہو چکی ہے۔ جسے سیاسی جوتشیوں اور جوگیوں نے جنرل مشرف کے مستقبل کیلئے اچھا شگون قرار دیا ہے۔۔۔ مگر واشنگٹن والا بابا اس اتحاد کو کیسے قبول کریگا۔۔۔ وہ تو کہتا ہے طالبان مولانا کے مدرسوں سے تربیت پاتے رہے ہیں۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔۔۔ ہنی بیگم بولیں۔۔۔ اگر واشنگٹن والے بابے کی نظر میں مشرف صاحب کو اگلے پانچ سال تک کانگرس مفید قرار دیتی ہے تو مولانا صاحب کو پاک صاف قرار دینا کوئی مشکل نہیں۔۔۔ تمہیں پتہ ہے کہ کچھ سال پہلے بابا کلنٹن نے مشرف صاحب سے ہاتھ ملانا گوارہ نہیں کیا تھا۔۔۔ اب بابا جی زلزلے کا نظارہ کرنے آئے تو ان کے ساتھ بڑے ابا جی بھی تھے اور دونوں نے کُٹ کُٹ کر مشرف صاحب کو جھپھیاں لگائیں، رات رہے، دعوتیں کھائیں جیسے دونوں بچپن سے اکھٹے گلی ڈنڈا کھیلتے رہے ہوں۔ تمہیں نظریہ ضرورت کا پتہ ہے۔۔۔ ہنی بیگم نے پوچھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ اخبار پڑا کرو۔۔۔ کمپیوٹر کی تھالی کے بینگن نہ بنو۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہو سکے تو پروفیسر اللہ لوک سے پوچھ کر شمع اور شبنم کے بجائے کبھی کبھی صائمہ سے بھی مل لیا کرو۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔ تم خود ہی کہتی ہو کہ وہ عام آدمی سے نہیں ملتی۔۔۔ پہلے ہی دو دیہاتی اس کے عشق میں مبتلا ہیں اور آتش عشق میں جل کر کوئلہ ہوگئے ہیں۔۔۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں بھی دیہاتی ہوں۔ میں نے ہنی بیگم کی بات کا جواب دیا۔۔۔ اچھا چھوڑو۔۔۔ ہنی بولی۔۔۔ یہ نظریہ ویسے تو ہماری عدالتوں اور بڑے ججوں نے ہمارے قانونی ماہروں کے دلائل سننے کے بعد تسلیم کیا تھا کہ جنرل ضیأ الحق کا مارشل لاء وقت کی ضرورت تھا۔۔۔ پھر اسی نظریے کے مطابق جنرل مشرف کا حق حکمرانی بھی تسلیم کرلیا گیا۔۔۔ دراصل یہ نظریہ بھی واشنگٹن ہی سے آیا تھا۔۔۔ واشنگٹن والا بابا اس نظریے کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔۔۔ جیسے شاہ ایران، صدام صاحب اور اسامہ صاحب کو ضرورت کے مطابق جھپھیاں لگائیں اور جب ضرورت نہ رہی تو لوگوں سے پوچھنے لگے کہ رضا شاہ پہلوی، صدام اور اسامہ کون ہیں۔ خفیہ حکومت کے کسی اہلکار نے بتایا کہ یہ لوگ جمہوریت اور امن کے دشمن ہیں اور دنیا بھر کے انسانوں کو ان سے خطرہ ہے تو۔۔۔ تو۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ اسامہ کا پتہ نہیں مردہ ہے یا زندہ۔۔۔ رضا شاہ بے وطنی میں مرگیا اور صدام پنجرے میں بند ہے اور مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ دنیا بھر میں واشنگٹن والے بابے سے اسامہ کے کاروباری تعلقات، رضا شاہ کی وفاداری اور صدام حسین کی یاری پر کتابیں لکھی گئیں، فلمیں بنیں، اخباروں نے کالم اور اداریے لکھے مگر بابا جی نے کسی بات کو خاطر میں نہ لایا۔ اڑدس پڑوس اور گھر والوں نے بھی سمجھایا کہ ان تینوں نے جو کچھ کیا آپ کے حکم اور مرضی سے کیا مگر بابا جی نے کسی کی نہ سنی چونکہ نظریہ ضرورت کے تحت اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔۔۔ ہنی بولی۔۔۔ اگر ضرورت کے تحت مولانا وزیراعظم بن گئے تو شوکت صاحب کہاں جائینگے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔

امریکہ۔۔۔ ہر کوئی کام کے بعد واپس اپنے گھر ہی جاتا ہے جیسے معین قریشی آئے تھے اور کام ُمکا کر واپس اپنے گھر چلے گئے۔۔۔ ہر کوئی اپنے گھر ہی تو جاتا ہے جیسے لوگ دوسرے ملکوں میں نوکری کرنے جاتے ہیں اور واپس گھر لوٹ آتے ہیں۔شوکت صاحب بھی کام کیلئے آئے ہیں اور کام کر رہے ہیں۔۔۔ہنی نے جواب دیا۔۔۔ویسے ابھی الیکشن میں سال کھنڈ باقی ہے تب تک شوکت صاحب پاکستانیوں کا کچومر نکال دینگے۔۔۔الیکشن تک گیس، پٹرول، چاول، چینی، آٹا، نمک، دال، صابن اور دوائیاں اتنی مہنگی کر دینگے کہ شائد لوگ ہجرت کر کے افغانستان چلے جائیں اور امریکی فوجی اڈوں کے باہر روٹی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں۔۔۔ یہ بدشگونی ہے ہنی۔۔۔ایسی باتیں نہ کرو۔۔۔اللہ ہمارے وطن کو سلامت رکھے۔۔۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ بش صاحب ہمیں ایسی حالت میں نہیں ڈالینگے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں۔۔۔ دعا کرو۔۔۔مگر ہمارے کرتوت ایسے نہیں کہ دعائیں قبول ہوں۔۔۔صائمہ کافی عرصہ تک پروفیسر اللہ لوک کو دعا کا کہتی رہی مگر پروفیسر نے اس طرف توجہ نہ دی تو وہ داتا صاحب چلی گئی۔۔۔ وہاں سے جواب ملا کہ یہاں بیٹھ کر کھاؤ پیو مگر دوسروں کی فکر نہ کرو۔۔۔ان بھوکے ننگوں اور عدل وانصاف کی بھیک مانگنے والوں سے کہو کہ اگر وہ سچے انسانوں، قابل اور اہل لوگوں کو ووٹ دیتے تو آج ان کا حشر یہ نہ ہوتا۔ یہ سب کھمبوں اور کھمبیوں کو ووٹ دینے کا نتیجہ ہے برادریاں اور غنڈے جن کے ایمان کا حصہ ہیں۔تھانیداروں، پٹواریوں اور نودولتیوں کی دھونس کے آگے جو لیٹ جاتے ہیں ان کیلئے ہم دعا نہیں کر سکتے۔۔۔ جاؤ کہہ دو ان بے ہمتوں کو کہ لاڑکانہ چلے جائیں۔۔۔ ہاں۔۔۔سیدھے لاڑکانہ ہی جائیں۔۔۔ بھٹائی، شاہ لونگ سندھی، شاہ عارف اروڑوی، شہباز قلندر یا پھر عبداللہ شاہ غازی کے در پر جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ہم سب ایک ہی پارٹی ہیں اور میرا جواب سب کا جواب سمجھو۔۔۔ہم سب اجلاس باطنی میں اکھٹے ہوتے ہیں۔۔۔ہم اللہ کے حکم کے بندے ہیں۔۔۔اللہ اپنے ارادے سے ہی اپنے بندوں کی سنتا ہے۔۔۔اللہ کے ماننے والے کھمبوں کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔۔۔ واشنگٹن والے بابے کو بھی پتہ ہے کہ ان سولہ کروڑ کھمبا پوجاریوں کی کوئی حیثیت نہیں۔۔۔اصل حیثیت نظریہ ضرورت کی ہے جسے وقتاً فوقتاً وہ اپنی ضرورت کی مطابق ہم پر لاگو کرتا رہتا ہے۔۔۔اب اگر اس نظریے میں مولانا فٹ آتے ہیں تو واشنگٹن والوں کو کیا اعتراض۔۔۔مولوی ہو یا مجاہد۔۔۔نام میں کیا رکھا ہے۔۔۔ باباجی کو کام چاہیے۔۔۔ ویسے میثاق جمہوریت بھی باباصاحب کی منظوری کیلئے بھجوا دیا گیا ہے۔۔۔اگر میثاق جمہوریت وردی سے بہتر ثابت ہوا تو پھر نہ ملاں نہ مولوی نہ وردی نہ دہشت گردی۔۔۔سب کچھ جمہوری طریقے سے ہوگا۔۔۔ ہاں نقصان پھر عوام کا ہی ہوگا۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔وہ کیسے۔۔۔ ہمارے دانشور اور محقق تو کہتے ہیں کہ جمہوریت اللہ کی نعمت ہے ڈاکٹر غامدی تو قرآن وسنت سے بھی جمہوریت کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں اللہ کی نعمت تو ہے اگر اسے اللہ کے بہت سے بندے اللہ کے کچھ بندوں کو حق حکمرانی دیں تو۔۔۔اگر اللہ کی بے ہنگم مخلوق کھمبوں پر مہریں لگا کر خوش ہو تو یہ نعمت نہیں عذاب ہے اور صائمہ کے مطابق اس بار یہ عذاب اور بھی بھیانک ہوگا۔۔۔ وہ کیسے میں نے پوچھا۔۔۔صائمہ کہتی ہے کہ میثاق جمہوریت مذاق جمہوریت میں بدل جائے گا۔۔۔اگر میثاق جمہوریت لاگو ہو گیا تو ڈپٹی کمشنر واپس آئینگے، جیالے اپنی بھیانک شکل وصورت کے ساتھ عوام پر ظلم وستم ڈھائینگے، احتساب بیورو والوں کا احتساب شروع ہو جائے گا، لیگی اتحاد ٹوٹ کر میثاق کا حصہ بن جائے گا۔ چھ سال سے جن لوگوں نے عوام کا خون نہیں چوسا وہ چھکیں لگا لگا کر عوام کا خون چوسیں گے۔مخالفین پر نئے مقدمے بنیں گے اور لوٹ مار کا ایسا بازار گرم ہوگا کہ عوام حسب سابق پھر رولا ڈالینگے کہ فوجی بھائیوں بچاؤ فوجی بھائیوں بچاؤ مگر فوجی داتا صاحب کی طرح کینگے نہ بھائی یہ ہمارا کام نہیں۔ہم جمہوری قوتوں کے تابع فرمان ہیں۔تم کھمبوں پر سر مارو یا پھر نظریہ ضرورت والوں اور میثاق جمہوریت والوں کے پاس جاؤ۔۔۔ پھر کیا ہوگا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔صائمہ کو پتہ ہوگا۔۔۔وہ داتا صاحب گئی تھی میں نہیں۔۔۔ہنی بولی۔۔۔اس کا مطلب ہے صائمہ بھی پہنچی ہوئی ہے۔میں نے کہا۔۔۔تھوڑی سی ہے۔۔۔اگر انسان عطر کی دوکان پر بیٹھے گا تو اس کے کپڑوں سے عطر کی خوشبو آئے گی۔صائمہ کبھی کبھی پروفیسر اللہ لوک کے پاس بیٹھتی ہے تو کافی دیر تک اس پر پروفیسر کا رنگ چڑھا رہتا ہے جسے وہ کافی دیر بعد زائل کرتی ہے مگر تمہیں شک ہے کیا؟۔۔۔پہنچی نہ ہوتی تو اتنے لوگ اس کے عشق میں مبتلا نہ ہوتے۔۔۔داتا صاحب، بھٹائی صاحب، شہباز قلندر، بابا فرید اور پتہ نہیں ایسے کتنے لوگ ہیں جہاں دن رات عاشقوں کی ٹولیاں آتی ہیں۔۔۔کہیں تم یہ تو نہیں کہہ رہی کہ للہ عارفہ یا پھر قراۃ العین طاہرہ کی طرح صائمہ بھی ایک بڑے مقام اور مرتبے پر فائیز ہونے والی ہے۔۔۔نہیں۔۔۔لِلہ اور طاہرہ کا ایسا مقام نہیں جیسے اقبال نے بیان کیا ہے۔۔۔للہ کا پھر بھی ایک مقام تھا مگر طاہرہ کا مقام وہی تھا جو شبنم اور شمع کا ہے۔۔۔مگر صائمہ متلاشی ہے۔۔۔ہوسکتا ہے وہ ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں بھٹ شاہ اور داتا صاحب سے ہو کر طالبان حق مدینہ جاتے ہیں۔۔۔مدینہ منورہ کا یہ سفر بھی تمثیلی ہے جو صرف اور صرف عاشقان رسول ﷺ اور طالبان حق ہی اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ کئی جہاز اسلام آباد، کراچی اور لاہور سے روزانہ جدہ جاتے ہیں۔۔۔ ہمارے سارے وزیر، وزیر اعظم اور صدور بھی حلف برداری کے بعد اپنی اپنی خالی بوتلیں لیکر دم کیا ہوا سستا تیل مانگنے حجاز مقدس جاتے رہتے ہیں۔ وہاں سے سولہ روپیہ فی بوتل کے حساب سے تیل لا کر 60 روپے کے حساب سے یہاں کے عوام کو بیچتے ہیں۔۔۔ یہ سفر وہ نہیں جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔۔۔اگر صائمہ کو جھٹکا لگ گیا تو اس کا سفر صدر مشرف، شوکت عزیز، بینظیر اور نواز شریف والا نہیں ہوگا۔

یہ سفر فنا فی الشیخ کی منزل سے شروع ہوتا ہے اور فنا فی اللہ پر ختم ہوتا ہے۔۔۔اس کا پہلا مقام عالم ناسوت کی پہلی منزل اور عالم لاہوت اس کی آخری منزل

ہے۔۔۔صائمہ ہو یا شبنم، مولانا فضل الرحمٰن ہوں یا پرویز مشرف۔۔۔اللہ جسے چاہے اور جب چاہے اپنے راستے پر قبول کرلے۔۔۔یہ سب عشق کے معاملات ہیں۔۔۔ تمہیں وقت ملے تو کبھی صائمہ سے مل لو۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔تم نے خود ہی کہا تھا کہ فی الحال وہ منتشر الخیال ہے اور پندرہ بیس لوگوں کی مشترکہ محبوبہ بھی ہے۔۔۔اب ایسی لڑکی کو ملنے کا فائدہ۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔فائدہ صرف یہی ہے کہ وہ متجسس ہے اور ہر جستجو کرنے والے کی ایک منزل ہوتی ہے۔۔۔اگر متجسس انسان مستقل مزاج بھی ہو تو اسے منزل ضرور ملتی ہے جیسے مہاتیر محمد کو نہ صرف منزل اور مقام ملا بلکہ اس کے سفر عشق میں شامل اس کی قوم بھی فیض یاب ہوئی۔۔۔ہوسکتا ہے صائمہ خود یا پھر اس کے عشق میں مبتلا کوئی طالب میثاق جمہوریت کے علاوہ کوئی ایسا منصوبہ پیش کرے جو کھمبا جمہوریت کا توڑ ثابت ہو اور لوگ نظریہ ضرورت کو مسترد کر کے نظریہ حقیقت کو اپنا کر ساٹھ سالہ آزادی نما غلامی سے نجات حاصل کرسکیں۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔ہاں اگر ہوسکے اور صائمہ تمہیں ٹائم دے تو اسے مل لینا۔۔۔ملنے میں کیا حرج ہے۔۔۔میں پروفیسر اللہ لوک سے پوچھ کر ملونگا۔۔۔میں نے کہا۔۔۔میں پہلے ہی پریشان حال ہوں۔۔۔نواز شریف، بینظیر اور مشرف صاحب بھی ان لوگوں کے حامی ہیں۔جنہوں نے مجھ پر ظلم کیا، میرا گھر لوٹا اور میری جان کے درپے ہیں۔۔۔میں بھی تو یہی کہتی ہوں کہ سب کا مشن ایک ہی ہے۔۔۔میثاق جمہوریت ہو یا نظریہ ضرورت تم جیسوں پر ظلم ہی ہوگا۔۔۔ہوسکتا ہے صائمہ سے ملکر تمہیں کچھ سکون ہی مل جائے۔۔۔اس کی باتیں بڑی میٹھی ہیں اور وہ ریا کار نہیں۔۔۔وہ جس سے ملتی ہے اسے یہ نہیں کہتی کہ مجھے بس تمہی سے پیار ہے۔۔۔وہ بیک ڈور ڈپلومیسی پر یقین نہیں رکھتی اور نہ ہی جھوٹی تسلیاں دیتی ہے۔وہ شوکت عزیز کی طرح بے حس اور عمر ایوب کی طرح متکبر نہیں وہ چوہدریوں کی طرح برادری ازم پر یقین نہیں کرتی اور نہ ہی ایم ایم اے والوں کی طرح کل پھر آنے کا کہتی ہے۔۔۔وہ یہ نہیں کہتی کہ میں تم پر مرمٹی ہوں۔۔۔تو پھر یہ اتنے چاہنے والے اسے کیوں چاہتے ہیں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔یہ ان کی مرضی ہے اس میں صائمہ کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس نے کسی کو اپنا منشور یا پھر چارٹرز آف ڈیمانڈ دیا ہے کہ اسے ضرور چاہا جائے۔۔۔اس کی محبت اور چاہت کے اصول پروفیسر اللہ لوک کے باطنی اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔۔۔پروفیسر اللہ لوک نے کوئی سائن بورڈ نہیں لگایا اور نہ ہی اخبار میں اشتہار دیا ہے کہ انہیں مل کر دل کی مرادیں حاصل کی جائیں۔۔۔وہ کسی جلسے میں خطاب نہیں کرتے اور نہ ہی علماٗ و مشائخ کونسل کے ممبر ہیں۔۔۔ان کی پبلسٹی کرنے والا بھی کوئی نہیں اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتے ہیں۔۔۔پروفیسر اللہ لوک کا راستہ صوفی نور الدینؒ مرحوم و مغفور والا ہے اور یہ راستہ بڑا ہی کٹھن اور دشوار ہے۔یہی سمجھو کہ ایک شخص پر لذت اور خوشبودار کھانوں کی کئی دیگیں لیکر راستے پر بیٹھا ہے اور ہر حاجت مند اور سوالی کو تھالیاں بھر بھر کر دیتا ہے مگر خود اسے کچھ کھانے کی اجازت نہیں۔وہ کیوں میں نے پوچھا۔چونکہ وہ سائل اور سوالی نہیں۔اس کا کام تقسیم کرنا ہے کھانا نہیں۔پرانے لوگ کہتے تھے کہ بادشاہ بھی ولّی اللہ ہوتا ہے مگر اب بادشاہوں کی جگہ صدر اور وزیر اعظم ہوتے ہیں جو خود بھوکے اور ننگے ہوتے ہیں اس لئے وہ تقسیم نہیں کرتے ہڑپ کر جاتے ہیں۔یہی حال سجادہ نشینوں اور گدی نشینوں کا ہے۔مگر جو اللہ کا بندہ ہے اسے بھوک نہیں ہوتی۔وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتا ہے اور ربّ کے خزانے تقسیم کرتا ہے۔شائد غنیؒ نے انہیں لوگوں کیلئے کہا تھا کہ

ہمچو سوزن دائیم از پوشش گریزا نیم ما
جامہ بہر خلق می دوزیم وعریاں نیم ما

ہم تو سوئی کی طرح ہیں جو لوگوں کے تن ڈھاپنے کیلئے لباس سیتی ہے مگر خود عریاں ہی رہتی ہے۔

(۶)

تم غنی کشمیریؒ کے متعلق کچھ جانتے ہو۔ہنی بیگم نے پوچھا۔۔۔نہیں۔۔۔میں نے غنی کشمیریؒ کے متعلق کبھی نہیں سنا۔۔۔میں نے دوبار سردار ابراہیم کو دیکھا ہے۔ اچھے آدمی تھے اللہ مغفرت کرے۔۔۔ان کی ایک کتاب بھی پڑھی ہے کافی سچی اور صاف باتیں لکھی ہیں۔۔۔اس دن میرے پاس پیسے تھے تو میں نے ایک نہیں بلکہ تین کتابیں خریدیں اور کتابوں کی دُکان کے قریب والے ہوٹل سے دال چاول بھی کھائے۔ میں نے کہا۔۔۔کیوں۔۔۔وہاں کوئی خاص چاول ہوتے ہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ چاول تو خاص نہیں ہوتے ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کبھی کبھی پروفیسر اللہ لوک بازار میں پیڑی پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔۔۔ہاں کبھی کبھی جب کوئی مہمان آجائے یا پھر پیسے ہوں تو۔ مگر اب دوسال سے پروفیسر اللہ لوک نے بازار جاکر اور پیڑی پر بیٹھ کر چاول بھی نہیں کھائے۔ہنی نے کہا۔۔۔ہاں ہنی تم شائد ٹھیک ہی کہتی ہو اب دال چاول بھی فیشن بن گیا ہے۔ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ دال چاول کھانے آتے ہیں۔۔۔سنا ہے اب چاولوں میں پستہ، بادام اور کاجو ڈالا جاتا ہے اور دال میں بھی بڑے قیمتی تڑکے لگتے ہیں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔بلکل ایسے ہی ہے۔۔۔لاہور میں ایک ایم ایم عالم روڈ ہے وہاں پر بیکری نما چائے کافی کی دوڈُکانیں ہیں۔۔۔پہلی دُکان ایک جرنیل کے بیٹے کی تھی۔۔۔اب دوسری کسی بڑے چوہدری نے کھولی ہے۔۔۔چلو اچھا ہے کوئی غریب دس روپے کی چائے اور پانچ دس کی پیسٹری سے تھوڑی عیش موج کرلے گا۔۔۔میں نے کہا۔۔۔نہ بابا نہ۔۔۔ان بیکریوں کی حدود میں غریب تو کیا امیر بھی نہیں جاسکتا۔۔۔ہنی بولی۔۔۔کیوں۔۔۔وہاں کیا ہے۔۔۔کچھ بھی تو نہیں۔۔۔وہی لاہور کے نلکوں کا پانی۔۔۔کسی گجر کی بھینس کا دودھ۔۔۔وہی چائے کی پتی۔۔۔وہی کافی کا ڈبہ۔۔۔پیسٹری بھی ویسی ہی ہے جیسے صبح صبح پھیری والا بابا اپنی سائیکل پر لاد کر گلی گلی گھومتا اور بیچتا ہے۔۔۔مگر پھیری والے کی پیسٹری اور خطائی کا ذائقہ اور خوشبو تو الگ ہی ہے۔۔۔تو پھر خاص بات کیا ہے ان بیکریوں میں۔۔۔خاص بات یہ ہے کہ وہاں صرف اور صرف خاص خواتین اور مرد آتے ہیں۔۔۔تمہیں پتہ ہے کہ خاص لوگ کون ہوتے ہیں۔۔۔اللہ کے خاص بندے۔۔۔جیسے تم کشمیر والے غنیؒ صاحب کا پوچھ رہی تھیں۔ جیسے لاہور والے داتا صاحبؒ جہاں صائمہ دعا کیلئے گئی تھی۔۔ حافظ صاحبؒ مردان والے بھی اللہ کے خاص بندے ہیں اور پروفیسر اللہ لوک کو تم خود جانتی ہو۔۔۔میں نے جواب دیا۔۔۔نہیں۔۔۔ہنی بولی۔۔۔اصل میں تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم دیہاتی دینی طبقے کے آدمی ہو جہاں خاص بندے کا مطلب اعلیٰ وارفع ہے مگر ماڈرن لائف میں خاص آدمی نہ آدمی ہوتا ہے نہ بندہ۔اسے سپیشل پرسن، اپر کلاس، سپر کلاس اور ہائی جینٹری کہا جاتا ہے۔وہ نہ بندوں میں اٹھتا ہے نہ بیٹھتا ہے نہ رہتا ہے۔اس کا تعلق آدمیت سے اتنا ہی رہ جاتا ہے جتنا ایک انسان کا مٹی سے۔

پہلے انسان کو ربّ نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر اس کی تخلیقی ہیت بدل دی مگر اس کا تعلق مٹی سے ہی رہا۔اب انسان جس بھی نوح ونسل اور کلاس کا ہو اسے جلا کر یا دفنا کر مٹی ہی کے حوالے کیا جاتا ہے۔۔۔اسی طرح پاکستان میں مقیم سپر کلاس اور ہائی جینٹری پیدائشی طور پر بندے، انسان اور آدمی ہی کی شکل کا طبقہ ہوتا ہے مگر اپنی ہیت بدل کر ایک مخصوص حلقے میں رہتا ہے جہاں مرتے دم تک وہ عام آدمیوں، انسانوں اور بندوں سے دور رہتا ہے۔اب تو ایسے لوگوں کے قبرستان بھی علیحدہ بن رہے ہیں جہان عام آدمی کا جانا اور دفنانا منع ہے۔۔۔

ہنی تم نے کبھی سپر کلاس والی پیسٹری کھائی ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔نہیں سونگھی ہے ہنی بولی۔۔۔پروفیسر اللہ لوک کے پاس ایک عورت آئی تھی دعا کیلئے۔۔۔ پروفیسر نے کہا نماز پڑھا کرو اللہ تمہاری دعا بھی اتنی ہی سنتا ہے جتنی میری اور دوسروں کی۔۔۔وہ پریشان ہوگئی اور کہنے لگی میں نماز نہیں پڑھتی چونکہ میرے کھانے سونے اور ملنے ملانے کے اوقات ایسے ہیں کہ نماز اس میں فٹ نہیں آتی۔۔۔ پروفیسر اللہ لوک نے بھی صاف انکار کردیا اور کہا کہ تم خود اپنے لئے دعا نہیں کرسکتی تو میں کیوں کروں۔ میرے پاس پہلے ہی سولہ کروڑ لوگوں کی درخواستیں موجود ہیں تم اپنا مسئلہ خود حل کرو۔ پروفیسر کا موڈ دیکھ کر وہ چلی گئی۔کچھ دنوں بعد سپر کلاس لیڈی نے فون پر بتایا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہے اور ساتھ ساتھ اس کا مسئلہ بھی حل ہورہا ہے۔۔۔پھر شائد اس کا مسئلہ پوری طرح حل ہوگیا ہوگا کہ ایک دن کالی مرسڈیز کار میں ایک ڈبہ ون بائٹ پیسٹریوں کا آیا جو شائد نذرانہ تھا مگر پروفیسر اپنی جگہ سے غیر حاضر تھے۔۔۔ڈرائیور سے مجھے ان دو بیکریوں کے متعلق بھی پتہ چلا کہ دو چار ون بائٹ پیسٹریاں اور کافی کا پیالہ دو ہزار میں ملتا ہے۔ یہ دونوں بیکریاں سپر کلاس کیلئے مخصوص ہیں جہاں دیگر پاکستانی نما انسانوں، بندوں اور آدمیوں کا داخلہ منع ہے۔ڈرائیور ہی نے لاہور، اسلام آباد، پشاور اور کراچی میں پرائیویٹ کلبوں کا بھی ذکر کیا جو کئی کنال پر محیط کوٹھیوں اور بنگلوں میں کھلے ہوئے ہیں جہاں سپر کلاس اور ہائی جینٹری جسمانی اور نفسیاتی تسکین کیلئے آتی ہے۔۔۔ویسے صائمہ کو بھی ان کلبوں کا پتہ ہے۔کچھ لڑکے اس کلاس کے بھی اسے چائے پانی آفر کرتے رہتے ہیں جن پر وہ تحقیق کررہی ہے کہ دس پندرہ سالوں کے اندر اندر کچھ عام بندے، انسان اور آدمی کن کن مراحل سے گزر کر اور اپنی ہیت بدل کر ہائی جینٹری اور سپر کلاس کے درجے پر پہنچے ہیں۔

ہاں میں تمہیں پیسٹریوں کے ڈبے کے متعلق بتا رہی تھی۔۔۔ہنی نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب ڈبہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔۔۔ڈبہ کھولا تو اندر کا منظر اس سے بھی خوبصورت تھا۔ڈبے میں ایک دنیا آباد تھی۔۔۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ۔۔۔سفید، گلابی، عنابی، سرخ اور پتہ نہیں کون کون سا

رنگ۔۔۔ مجھے تو اتنے رنگوں کے نام بھی نہیں آتے۔۔۔ڈبے میں اگر بیس پیسٹریاں تھیں تو ان کے رنگ بھی بیس ہی تھے۔مگر خوشبو نہیں تھی۔۔۔ پروفیسر اللہ لوک کی والدہ کہتی ہیں کہ ذائقے کا تعلق خوشبو سے ہے۔جس چیز کی خوشبو نہیں وہ بدذائقہ ہے۔۔۔حسن رنگ میں نہیں۔۔۔حسن خوشبو اور ذائقے میں ہے۔۔۔صائمہ کی دادی بھی شائد اسی نسل کی عورت تھی جسے زندگی کی حقیقت اور حسن کی لطافت کا اندازہ تھا۔۔۔رنگ اور تصویر حسن کی ایک ادنیٰ قسم ہے جیسے ریت پر بنی تصویر۔۔۔حسن کی اعلیٰ وارفع اقسام لامحدود ہیں جنہیں صرف بندے، آدمی اور خاص انسان ہی پرکھ سکتے ہیں۔اگر یہ بندے خاص بندے، خاص آدمی اور خاص انسان ہوں تو حسن خوشبو اور ذائقے کی اصل شکلیں اور اقسام نہ صرف ان کی دسترس میں ہوتی ہیں بلکہ وہ عام بندوں، انسانوں اور آدمیوں کو بندگی، انسانیت اور آدمیت کی تعلیم دے کر قومی کردار کی تعمیر کا موجب بھی بنتے ہیں۔۔۔

تم ڈبے کی بات کر رہی تھی۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ہاں کہا ناں کہ ڈبے میں رنگ ہی رنگ تھے خوشبو نہیں تھی۔۔۔جب خوشبو نہ ہو تو ذائقہ بھی نہیں ہوتا اس لئے میں نے ڈبہ ایک طرف رکھ دیا۔۔۔اگلے روز پروفیسر آئے تو انہوں نے بغیر پوچھے، بغیر کھولے اور دیکھے ڈبہ اٹھا کر صفائی والے لڑکے کو تھما دیا۔۔۔پھر کیا؟۔۔۔صفائی والا لڑکا فوراً بولا کہ ڈبہ اسے میم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔جو یہاں سلیولس شرٹ اور جینز میں آئی تھی۔۔۔مگر ڈبہ تو پروفیسر صاحب کیلئے آیا تھا میں نے پوچھا۔۔۔نہیں ڈبہ اسی کا ہوتا ہے جو اسے خوشی سے وصول کرے اور کھائے۔۔۔ یہ ڈبہ بلکہ ایسے بہت سے ڈبے پروفیسر کی معرفت صفائی والے لڑکے، شبنم، سارہ، شمع، سیما، قسور خان اور خلیفہ کیلئے آتے ہیں جو پہچان کر یہ لوگ لے جاتے ہیں۔پروفیسر کو ایسے ڈبوں سے غرض نہیں۔۔۔اب تو دو سال سے پروفیسر نے دال چاول بھی کھانا چھوڑ دیے ہیں چونکہ چاولوں میں بھی خوشبو اور ذائقہ نہیں رہا۔چاولوں کی اپنی خوشبو ناپید ہو رہی ہے۔اب چاولوں کی جگہ پستے بادام اور کاجو کی باس آتی ہے۔اصل چیز خوشبو ہوتی ہے۔باس اور سٹرانڈ کو خوشبو نہیں کہہ سکتے۔۔۔مگر ہنی پستے بادام اور کاجو کی بھی تو خوشبو ہوتی ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہوتی تھی جب پستے بادام اور کاجو کابل اور کشمیر سے آتے تھے۔۔۔اب کابل اور کشمیر سے آنے والے میوے میں انسانی خون کا ذائقہ اور خوشبو شامل ہو گئی ہے جبکہ امپورٹڈ میووں میں خوشبو اور ذائقہ ہوتا ہی نہیں۔۔۔عام آدمی کشمیر اور کابل سے آنے والے میووں کو اس لئے نہیں کھاتا چونکہ اس میں ان جیسوں کا خون شامل ہے۔سپر کلاس کو اس خون سے ویسے ہی نفرت ہے چونکہ یہ خون ان کی مزید ترقی اور خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔۔۔ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس سارے فتنے کی جڑ ہماری تاریخ اور اسلامیات کا مضمون ہے۔۔۔سنا ہے ہنی ہمارے وزیر تعلیم اور ان کی پیش رو وزیر نی مل ملا کر تاریخ اور اسلامیات کو تعلیمی نصاب سے خارج کرنے کی کوشش میں ہیں۔ان دونوں کی اس کوشش پر بش صاحب اور چاول صاحبہ نے انہیں نہ صرف پسندیدہ شخصیات میں شامل کر لیا ہے بلکہ دو چار ڈبے ڈالروں کے بھی بھجوائے ہیں اور کہا ہے کہ اگر آپ دونوں ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر مہدی حسن، ڈاکٹر پرویز ھود بھائی اور ان کے ہم خیال مفکرین کی مدد سے اسلامی تاریخ اور اسلامیات کو پاکستان سے نکال دیں تو آپ سب کا اہل مغرب اور امریکہ پر بڑا احسان ہو گا اور اس کوشش میں ڈالروں کے جتنے ڈبے درکار ہونگے آپ کی خواہش کے مطابق جہاں آپ چاہیں گے بھجوا دیئے جائینگے۔۔۔چاول بیگم سے تمہاری کیا مراد ہے۔۔۔ہنی بیگم نے پوچھا۔۔۔کونڈالیزا رائس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔۔۔میں نے جواباً پوچھا۔۔۔ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ہمارے سولہ کروڑ اردو میڈیم لوگوں کو سمجھانے کیلئے ترجمے والا نام اچھا رہیگا۔۔۔ویسے گوروں کے نام ایسے ہوتے ہیں کہ ترجمے سے گالی گلوچ بن جاتے ہیں اور ایسا ترجمہ ہمارے قومی مفاد کے منافی بھی ہو سکتا ہے۔۔۔مگر رائیس کا ترجمہ چاول ہی بنتا ہے جو برا نہیں چونکہ یہ ایک اچھی غذا ہے اور امریکیوں کو بھی پسند ہے۔۔۔

تمہارا کیا خیال ہے ہنی۔۔۔ ہمارے وزیر تعلیم جنرل قاضی اور زبیدہ جلال اسلامیات اور تاریخ اسلام میں ردو بدل کر کے عام آدمی کے ذہن سے اسلام اور مسلمان ہیروز کے کارناموں کو نکال سکیں گے۔ میں نے پوچھا۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔ڈالروں کے بند باندھنے سے جذبوں کے دریاؤں کے رخ نہیں بدل سکتے اور نہ ہی روح کی بلند پروازی میں دولت کے پہاڑ رکاوٹ بن کر اسے پست کر سکتے ہیں۔جذبات اور احساسات کا تعلق بھی روح ہی سے ہے جسے پست کرنا انسانی دسترس میں نہیں اور نہ ہی انسانی دماغ سے کوئی ایسی سائنسی ایجاد وجود پذیر ہوئی ہے جو جذبے اور روح کی کیفیات کا اندازہ کر کے اسے تابع فرمان کر سکے۔ہنی نے جواب دیا۔۔۔مگر ہنی ڈاکٹر شاہد مسعود نے اپنے ٹی وی شو میں ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر اسرار اور ڈاکٹر مہدی حسن کو روح اور ربّ پر بحث کیلئے بلایا تھا۔اس مباحثے میں بڑی عجیب عجیب باتیں میں نے سنی ہیں۔ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا کہ اللہ کو انٹم انرجی ہے۔یعنی کو انٹم انرجی ہی اللہ ہے جبکہ روح کے متعلق تینوں کا نقطہ نظر مختلف تو تھا ہی مگر کچھ عجیب بھی تھا۔مجھے سب سے زیادہ حیرانی ڈاکٹر اسرار کے جوابات پر ہوئی جو قرآن سے کوئی دلیل پیش نہ کر سکے۔ڈاکٹر جاوید اقبال کا بھانڈہ روحانیت کے نور سے ویسے ہی خالی ہے جس کا انہوں نے دبے لفظوں میں اعتراف بھی کیا جبکہ ڈاکٹر مہدی حسن شائد بش برادری سے آخری عمر میں کسی بڑے انعام کی امید لگائے ہوئے ہیں اس لئے موصوف نے نہ صرف ذات الٰہی کی تعریف کو انٹم انرجی کے طور پر کی بلکہ قرآنی علوم کا بھی تمسخر اڑایا۔۔۔ہاں۔۔۔تم ٹھیک کہتے ہو۔صائمہ بھی ٹیلیویژن کے سارے پروگرام دیکھتی ہے اور کبھی کبھی ان بے تکے پروگراموں اور ان کے پیشکاروں کی ذہنیت پر دکھی ہو جاتی ہے۔۔۔کچھ ٹیلیویژن پروگراموں میں بعض اوقات بڑا اسیر لیس میٹر اور میسیج ہوتا ہے۔یہ لوگ جان کر ایسے لوگوں کو اپنے شو میں مدعو کرتے ہیں جو تاریخ اسلام، قرآن اور اسلام کی دبے لفظوں میں نہ صرف توہین کرتے ہیں بلکہ اہل مغرب کو اپنی وفاداری کے پیغام بھی دیتے رہتے ہیں۔ان دنوں یہ لوگ

بچوں اورنو جوانوں کوزنا کے طریقے سمجھا رہے ہیں کہ زنا باالجبر اور زنا باالرضا کیا ہوتا ہے۔آج کل بچے استادوں اور ماؤں سے پوچھتے ہیں کہ زنا کیا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے چونکہ صبح سے رات گئے تک پرائیویٹ چینلوں پر اسلامیات کے نصاب سے خروج اور زنا کی تعلیم پر ہی باتیں ہوتی ہیں۔۔۔صائمہ کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا ہے کہ اللہ کے نام مذکر ہیں مونث کیوں نہیں۔جس پر شاہد مسعود سمیت سب حاضرین نے قہقہ لگایا۔ڈاکٹر مہدی حسن کو قرآنی علوم کی لامحدودیت پر بھی اعتراض تھا۔اس نے کہا کہ قرآن میں صرف کھجور، انگور، انجیر اور انار کا ذکر ہے چونکہ عرب میں یہی پھل ہوتے ہیں۔اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں آم، مالٹے، کینوں، سیب اور دوسرے پھلوں کا ذکر کیوں نہیں۔۔۔شائد وہ یہ پیغام دے رہے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں یا پھر نعوذ باللہ۔اللہ کا علم محدود ہے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔ہاں یہی وہ پیغامات ہیں جو ہمارے دانشور اہل مغرب کو دیتے ہیں کہ ہم پاکستان میں تو رہتے ہیں مگر بندے آپ کے ہیں۔ہمیں اسلام سے اور قرآن سے اتنی ہی چڑ ہے جتنی آپ کو ہے۔ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق آپ کی خدمت کر رہے ہیں آپ ہمارے مفادات کا خیال رکھیئے۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔صائمہ اور کیا کہتی ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔اکثر غمزدہ اور پریشان ہوجاتی ہے۔۔۔صائمہ کہتی ہے کہ آج ہماری اخلاقی اور روحانی حالت تقریباً وہی ہے جو چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں اہل بغداد کی تھی۔ایک طرف تاتاری طوفان بغداد کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف امرأ و سلاطین باہمی خلفشار میں الجھے ہوئے تھے۔علمأ فضول اور لاحاصل بحثوں میں الجھ کر عوام کی روحانی اور اخلاقی تربیت سے کنارہ کش ہوکر شیعہ سنی فسادات اور بغاوتوں کی راہ ہموار کر رہے تھے اور قومی خزانہ فوج کی تربیت اور عوام کی فلاح و بہبود کے بجائے امرأ کی عیاشیوں پر خرچ ہو رہا تھا۔اگر آپ 655 ہجری کے بغداد کے حالات کا آج کے اسلام آباد کے حالات سے موازنہ کریں تو حالات میں کافی یکسانیت نظر آتی ہے۔آج ہمارے دانشور وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو تب کے دانشوروں نے کہا اور ان میں سے بہت سوں نے تاتاریوں کی آمد کیلئے رائیں بھی ہموار کیں مگر جب تاتاری بغداد میں آئے تو سب سے پہلے انہیں غداروں کے سر قلم کئے چونکہ انہیں خطرہ تھا کہ جو اپنوں کے نہیں بنے وہ ہمارے کب بنیں گے۔۔۔ہنی۔۔۔یکم جون 2006ء کو ڈاکٹر شاہد مسعود کے ایک شو میں شیخ رشید نے کہا ہے کہ ان کے بہت سے کارناموں میں ایک میڈیا کی آزادی ہے جس کا کریڈٹ جنرل مشرف کو جاتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ملک عملاً مافیا کے قبضے میں ہے اور مختلف مافیاجات حکومت کو بھی کنٹرول کر رہے ہیں۔اسی رات ہم ٹیلیویژن پر مجیب پیرزادہ ایڈوکیٹ آف سپریم کورٹ نے ججوں کی تعینات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی خدمات دیکھ کر وکلأ کو اعلیٰ عدالتوں میں جج تعینات کیا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت وہ حکومتوں اور لیڈروں کی مدد کرسکیں اور حکومتی پالیسوں کے خلاف فیصلے نہ کریں۔۔۔یکم جون ہی کی رات کو کیپیٹل ٹاک شو میں عمر ایوب انتہائی غصے میں آیا اور بات بات پر ڈاکٹر زبیر اور پروفیسر خورشید کو بے عزت کیا اور انتہائی توہین آمیز الفاظ میں انہیں ڈانٹتا رہا۔عمر ایوب کے لہجے سے لگتا تھا کہ حکومت جنرل مشرف کی نہیں بلکہ اس کے دادا ابو فیلڈ مارشل ایوب کی ہے۔۔۔صائمہ نے اس پر کچھ کہا ہے؟۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔وہ جتنے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھتی ہے انہیں نوٹ کر کے ان پر تبصرہ لکھتی ہے اور پھر پروفیسر اللہ لوک کے ساتھ اس پر کئی کئی گھنٹے بحث کرتی ہے۔۔۔پروفیسر کیا کہتے ہیں۔۔۔کچھ بھی نہیں بس آنکھیں بند کر کے صائمہ کو سنتے رہتے ہیں۔البتہ شبنم اور شمع کی بات بغور سنتے ہیں اور بعض اوقات ان کی جھوٹی کہانیوں پر یقین بھی کر لیتے ہیں مگر تھوڑی دیر کیلئے۔۔۔جھوٹی کہانیوں پر یقین کر لیتے ہیں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہاں کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے۔۔۔شبنم اور شمع ایسے وقت میں آتی ہیں جب پروفیسر اللہ لوک ذکر الٰہی میں مصروف نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو ان کی آمد سے ذکر اللہ کا سلسلہ خود بخود رک جاتا ہے۔۔۔رک جاتا ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہاں رک جاتا ہے۔۔۔ہنی بولی۔۔۔۔یہ ویسے ہی ہے جیسے برقی رو کے راستے میں ربڑ کا ٹکڑا رکھ کر برقی ذرات کے بہاؤ کو روک دیا جائے۔۔۔حافظ فضل مالکؒ کہتے ہیں کہ فقیر اور اللہ کا رشتہ یوں ہے جیسے ایک بڑی برقی تار پر بیشمار لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اپنی تار جوڑ کر اس سے قوت حاصل کر رہے ہوں۔۔۔یعنی ایک بڑی ہائی ٹنشن وائیر پر بہت سے لوگوں نے کنڈے اور کنڈیاں ڈال رکھی ہوں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہاں ایسے ہی سمجھو۔۔۔ہنی بولی۔۔۔اب آپ کی تار کی قوت پر منحصر ہے کہ آپ کتنا کرنٹ برداشت کر سکتے ہو۔جس کا جتنا تزکیہ و مجاہدہ ہوگا اور پیر کامل و اکمل ہوگا اس میں اتنی ہی برداشت کرنے کی سکت اور قوت بھی ہوگی۔۔۔جب ولّی اور اللہ کا رابطہ ہوجاتا ہے تو اسے فنا فی اللہ کی منزل کہتے ہیں مگر یہ منزل پیر اکمل کی وساطت اور اجلاس محمدی ﷺ میں حاضری کے بغیر ممکن نہیں۔۔۔اگر ولّی اکمل ایک طالب حق کو اجلاس باطنی میں غوطہ زن نہ کرے تو اس کے بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔۔۔وہ کیسے میں نے پوچھا۔۔۔یہ ایک الگ بحث ہے کبھی صائمہ کی موجودگی میں تم پروفیسر اللہ لوک سے اس پر بات کر سکتے ہو۔۔۔بھٹکنے سے مراد فقر کی آڑ میں دکانداری چمکانا اور لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔۔۔دراصل یہ دکانداری ناسوتی کمالات کا کرشمہ ہوتا ہے جس کیلئے کسی دین و مذہب کی پیروکاری کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔کوئی بھی انسان تزکیہ نفس سے اپنی ذات کے کمالات سے یہ کرشمہ سازی کر سکتا ہے جیسے ہندو جوگی اور سادھو بھی باتیں بتاتے ہیں۔اسی طرح بعض مسلمان فقرأ نے بھی ناسوتی کمالات کا مظاہرہ کر کے اپنی اپنی خانقائیں اور دربار بنا لیے مگر یہ سب محض دکانداری ہے جس کا روحانی حقیقی علوم اور باطنی اسرار سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ہنی تم بتا رہی تھی کہ شبنم اور شمع پروفیسر اللہ لوک کو کبھی کبھی ورغلا لیتی ہیں اور پروفیسر ان کی باتوں کا یقین بھی کر لیتے ہیں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ہنی نے جواب دیا۔۔۔شبنم اور شمع ہی نہیں بلکہ اس طرح کا جو بھی مرد یا خاتون جب طالب حق کے قریب ہو تو طالب اپنی کنڈی بڑی تار سے اُتار لیتا ہے تاکہ اس کے قریب بیٹھے لوگوں پر تجلیات کا اثر نہ ہو۔بعض

اوقات حاضرین میں سے اکثر ناپاک ہوتے ہیں جن پر ولّی کی نگاہ برق بن کر گرسکتی ہے اوران کا نقصان ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔۔۔دیکھوتمہاری آسانی کیلئے میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔ہنی نے ذراواضح الفاظ میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔اگرایک بڑا برقی قمقمہ جس کی روشنی اور حرارت کئی ہزار وولٹ ہواوراس کا رخ اچانک کسی کمزور چیز کی طرف کردیا جائے تو کیا ہوگا۔۔۔میں نے جواب دیا وہ فوراً جل کر بھسم ہوجائے گی بلکہ اس کا وجود ہی مٹ جائے گا۔۔۔دیکھو یہ ایک برقی آلے اور برقی حرارت کی ادنیٰ سی مثال ہے۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔جنات میں اس سے کئی گنا آتش ہے چونکہ وہ آگ ہی کے بنے ہیں اور سورج جیسے آتشی اور ایٹمی حرارتی وجود کی آتش وتپش جنات پر اثر نہیں کرتی۔اب نور کی لطافت کا اندازہ ہی نہیں کہ اس میں ہزاروں، لاکھوں سورج سما جائیں۔پھر نور کی کروڑوں اقسام ہیں کئی لطائف ہیں جن سے گزر کر ایک ولّی اپنی روح کی قوت سے اللہ کے نور یعنی نور احد سے تعلق جوڑتا ہے جسے آسان زبان میں حافظ فضل مالکؒ بڑی تار کہتے ہیں۔ایک ولّی جب فنا فی اللہ کے مقام پر ہوتا ہے تو اس کے قریب ایک باپاک، کمزوراور کمتر وجود اپنی ہستی وحیثیت برقرار نہیں رکھ سکتا اس لئے ولّی پر لازم ہے کہ وہ عام لوگوں کا خیال کرتے ہوئے اپنا ظاہری رابطہ بڑی تار سے وقتی طور پر منقطع کرلے جبکہ باطنی رابطہ ہماوقت برقرار رہتا ہے۔۔۔ایسے ہی وقت میں جب شبنم اور شمع یا دوسرے لوگ پروفیسر اللہ لوک کی محفل میں آتے ہیں تو ان کی بعض باتیں انہیں متاثر کرلیتی ہیں جو وقتی اثر ہی رکھتی ہیں۔اس سے کسی دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا چونکہ ولّی بدعا کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ہنی تمہارا مطلب ہے پروفیسر اللہ لوک ولّی ہیں۔میں نے یہ نہیں کہا اور نہ ہی پروفیسر اللہ لوک نے فقر وولائت کا دعویٰ کیا ہے۔وہ مشائخ کونسل کے رکن بھی نہیں اس لئے میں انہیں اپنی طرف سے ولّی اللہ کا خطاب نہیں دے سکتی۔۔۔میں اصول وضابطے کی بات کررہی تھی کہ ایک ولّی پر بھی مادیت کا اثر ہوتا ہے مگر اسے زائل کردیا جاتا ہے۔شبنم اور شمع کو ہر لمحے خطرہ رہتا ہے کہ ان کے خفیہ رازوں سے پردہ نہ اٹھے حالانکہ ان کا کوئی کام خفیہ ہے ہی نہیں۔وہ جس لائن پر چل رہی ہیں وہ سکائی لائن سے گزرتی ہے جس پر ہر کسی کی نظر ہوتی ہے مگر انہیں کچھ نظر نہیں آتا اس لئے وہ اپنے دفاع کے بجائے دوسروں پر حملہ آور رہتی ہیں۔۔۔ہنی پروفیسر کو تو ان سب باتوں کا پتہ ہونا چاہیے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔پروفیسر سب جانتے ہیں مگر اللہ کے در سے پرامید ہیں کہ شائد یہ لوگ اور ان جیسے دیگر لاکھوں ہزاروں بندے اور بندیاں سدھر جائیں۔۔۔ایک طالب حق کبھی مایوس نہیں ہوتا اور ہمیشہ خیر وبرکت کی امید رکھتا ہے۔ہاں اگر تم ان اصولوں اور ضابطوں اور ایک ولّی کامل کے روحانی سفر، باطنی کمالات، لطائف اور منازل کا مطالع کرنا چاہو تو صوفی محمد نور الدینؒ اویّسی امینی کشمیری کی تصانیف منازل فقر، حقیقت تصوف، تاریخ خلافت اسلامی اور راہ حقیقت کا مطالع کرو۔صوفی صاحبؒ نے نہایت آسان اور عام فہم الفاظ میں عالم ناسوت تا عالم لاھوت تک کی تمام منازل و لطائف کا ذکر کیا ہے تا کہ اس علم کا شوق رکھنے والے طالبان حق دردر کی ٹھوکریں کھانے اور شعبدہ باز پیروں کے آستانوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک اصول وضابطے کے تحت روحانی علوم کی روشنی میں منازل فقر کو درجہ بدرجہ طے کرکے اپنے اصل مطلوب ومقصود تک پہنچ سکیں۔۔۔ایک طالب جب قرآنی روحانی علوم کی روشنی میں تزکیہ ومجاہدہ اختیار کرکے راہ حق پر چلتا ہے تو اس کے بھٹکنے کے مواقع کم ہوجاتے ہیں۔اگر لگن سچی ہو تو طالب کو ایک رہبر کامل کی رہنمائی خودبخود حاصل ہوجاتی ہے اس کیلئے کسی پیر یا ولّی کو ڈھونڈنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔طالب کی چاہت اور جستجو کو دیکھتے ہوئے وقت کا ولّی کامل خود طالب کو اپنے پاس بلالیتا ہے اور اس کی قلبی تسکین کا سامان مہیا کرکے اس کے باطنی اور روحانی سفر کی منازل خود طے کرواتا ہے۔۔۔ہنی کہتے ہیں کہ صوفی نور الدین صاحبؒ کو خود ان کے مرشد مولوی محمد امین کشمیریؒ نے اپنے ہاں طلب کیا تھا۔۔۔ایسے ہی ہوتا ہے۔۔۔ہنی نے جواب دیا۔۔۔اللہ مسبب الاسباب ہے۔۔۔چاہت میں تشنگی وتڑپ اور ارادے کی مضبوطی ہو تو لاکھوں میل کی مسافت دو قدم پر آجاتی ہے۔۔۔شاہ ہمدانؒ بھی خود ہی کشمیر آئے چونکہ وہاں تزکیہ ومجاہدہ کی منازل طے کرنے والے سینکڑوں جوگیوں، جوتیشوں اور دیوانہ وار جنگلوں میں احد احد کی صدائیں لگانے والوں کی خواہش تھی کہ کوئی رہبر کامل ان کی رہنمائی کے لئے آئے۔۔۔داتا صاحبؒ بھی خود ہی آئے۔۔۔عبداللہ شاہ غازیؒ بھی بلائے نہیں گئے تھے خود آ گئے تھے۔۔۔شمس تبریز کو مرشد نے حکم کیا کہ ترکی جاکر مولانا رومؒ کے معاملات درست کرو۔۔۔یہ سب ان دیکھی حکومت ہے جسے نارمل آنکھ سے نہیں دیکھا جاتا۔۔۔میں نے کہا تھا ناں کہ اصل قوت روح ہے اور روح ہی حقیقت ہے جسے فنا نہیں۔۔۔مادہ روح کی قوت سے اپنا وجود برقرار رکھتا ہے اور ہیت بدلتا ہے جبکہ روح نور کی جز ہے جو کمتر حیثیت میں زندگی کو برقرار رکھتی ہے مگر اپنی اصل سے یعنی نور حق سے ہماوقت رابطے میں رہتی ہے۔۔۔اگر انسان چاہے تو اپنی زندگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی روح کو اس کی اصل سے قوی تر حیثیت میں جوڑ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قوت بخش بنا سکتا ہے اور نہ چاہے تو اسے اپنے گناہوں سے کمزور کرکے سجین کی طرف دھکیل سکتا ہے۔۔۔یہی وہ علم ہے جس پر بحث کیلئے شاہد مسعود نے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا نہ تو مشائدہ اسرار الٰہی تھا اور نہ ہی وہ تزکیہ ومجاہدہ کی تربیت گاہ سے گزرے تھے۔شاہد مسعود، انیق ناجی اور دوسرے محقق خود اپنی تحقیق میں ادھورے ہیں اور بغیر کسی بنیادی علم وسمجھ کے محض روٹی کے حصول کی خاطر دینی علوم اور دین کی روح کی تحقیر کرکے اپنے آقاؤں کو خوش کرتے ہیں جو کسی طور درست قدم نہیں اور نہ ہی دین اسلام، مسلمان اور انسانیت کی خدمت ہے۔۔۔ہنی اگر یہ لوگ اس موضوع پر بحث کرنا ہی چائیں تو انہیں کوئی روک تو نہیں سکتا چونکہ یہ سب حکومتی پالیسی ہے جو کہ روشن خیالی اعتدال پسندی کی پرویزی تھیوری کے عین مطابق ہے۔میں نے پوچھا۔۔۔تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔اگر یہ لوگ روح، اللہ اور روحانیت پر بحث کرنا ہی چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ پہلے تزکیہ نفس کریں اور کتاب اللہ کا صدق دل سے مطالعہ کریں ورنہ اندھیرے میں گتکا کھیلنے سے اپنا سر بھی پھوڑ دینگے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبینگے۔ایسا

عالم جس کا اپنا علم ادھورا ہو وہ انسانیت کی رہنمائی کا حق نہیں رکھتا۔ خاص کر باطنی علوم کا علم نہ رکھنے والے پر لازم ہے کہ وہ اس پر بحث کر کے عام آدمی کو گمراہ نہ کرے۔ جہاں تک تمہارے سوالات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ کے دو تاریخی واقعات میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔

قبلہ محمد نور الدینؒ اویسّی امینی کشمیری مرحوم و مغفورؒ جن کی قبر ایبٹ آباد لنک روڈ کے ایک گھر کے پچھواڑے میں ہے کا تعلق وادی کشمیر سے تھا جو اپنے مرشد قبلہ مولوی محمد امینؒ کے حکم کے تابع روحانی علوم کی تبلیغ کا مشن لیکر پاکستان آئے اور ایک طویل عرصہ تک طالبان حق کی رہنمائی کرتے رہے۔۔۔ آزاد کشمیر کے ایک گاؤں کے ہائی سکول میں ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کسی دوسرے سکول سے تبدیل ہو کر آئے۔ جن کا تعلق پنجاب سے تھا اور اہل حدیث مسلک کے ماننے والے تھے۔ اسی سکول کے کچھ استاد صاحبان علاقہ کے ایک درویش صفت شخص کے دوستوں میں سے تھے جن کی وساطت سے انھیں قبلہ صوفی نور الدینؒ کا قرب حاصل تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی کچھ عرصہ بعد اپنے سکول کے استادوں اور درویش کی کوششوں کے نتیجہ میں صوفی صاحبؒ سے ملنے ایبٹ آباد گئے اور پہلی ہی نظر میں ان کی کایا پلٹ گئی۔۔۔ تھوڑی سی محنت اور تزکیہ کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب بامشائدہ ہو گئے جسے پانے کیلئے ایک طالب حق زندگی کا طویل عرصہ گزار دیتا ہے مگر حقیقی مشاہدہ اور علم کا سراغ بھی نہیں ملتا۔۔۔

یہی ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی تصنیف کے حاشیہ پر اپنے مبارک قلم سے لکھتے ہیں کہ ایک روز میں صوفی نور الدین صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ سخت بیمار تھے۔ اتنے نڈھال کہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی عاجز تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں بڑا پریشان ہوا۔ خدا جانے میرے ذہن میں کیا آیا کہ خود اپنی جسارت پر حیران ہوں۔ میں نے اپنے ہاوی و ناصر کو نبی ﷺ کے دربار میں پیش کیا۔ آپ کی محبوبیت کے طفیل حضور ﷺ نے شفقت فرمائی اور چند ہی لمحوں میں قبلہ نور الدینؒ بھلے چنگے ہو کر اٹھ بیٹھے اور گفتگو میں علم و حکمت کے موتی لٹانے لگے۔ دوران گفتگو آپ نے بتایا کہ میں تمہاری سادہ اور معصوم حرکت سے بے خبر نہیں۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ وہ پیر ہی کیا جو اپنے مرید کی ہر ہر حرکت سے باخبر نہ ہو۔ فرمایا تم نے توجہ دی میں ٹھیک ہو گیا۔ آپ کے روئے پر انوار کی قسم آپ کے وسیلہ سے ایک طالب کو جو فیض و برکات اور شرف حاصل ہوتا ہے اس کا تصور بھی ناممکنات سے ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ تو ہے تصویر کا ایک رخ کہ ایک ولّی کے معاملات کو ایک ادنیٰ مرید اور طالب اپنی روحانی قوت جو اسے فنا فی الشیخ کے مراتب سے ہی حاصل ہوتی ہے کو آزماتے ہوئے شیخ کے ظاہری معاملات کو اجلاس محمدی ﷺ میں پیش کر کے عاجزانہ درخواست کرتا ہے اور اپنے مرشد کے معاملات اجلاس حضوری ﷺ سے درست کرواتا ہے۔ مرشد حق اور ولّی اکمل کو بھی مرید کی اس حرکت کا پتہ ہے مگر وہ اپنے ذاتی معاملات خود نبی ﷺ کے اجلاس میں پیش کر کے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا۔۔۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔۔۔ یہی ہیڈ ماسٹر صاحب جن کا تعلق ایک خاص قبیلے سے تھا اور جس سکول اور علاقہ میں وہ رہتے تھے وہاں اس قبیلے کی اکثریت تھی۔ سکول میں پڑھانے والے استادوں کی کثیر تعداد بھی اسی قبیلے سے تھی جو سب کے سب صوفی نور الدین صاحبؒ کے مریدوں میں شمار ہوتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک صاحب علم ہستی تھے اور ساتھ ساتھ پیر بھی مشہور ہو گئے اور علاقے کی بااثر شخصیات کے منظور نظر ٹھہرے۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیڈ ماسٹر صاحب کا سکول انکی برادری کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ سیاسی جوڑ توڑ اور دوسری برادریوں کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور ہیڈ ماسٹر صاحب اس ساری کاروائی کو دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہے۔۔۔ ایک بااثر شخص نے انتظامیہ کی مدد سے ایک دوسری برادری کی زمین پر قبضہ کر کے وہاں اپنا پلازہ، پٹرول پمپ اور دفتر تعمیر کرنے کیلئے قبضہ گروپ تشکیل دیا جس میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے سکول کے اکثر استاد بھی شامل ہوئے۔ بااثر شخص نے مفروروں کی مدد سے زمین پر حملہ کیا اور ایک سازش کے تحت کچھ لوگ قتل کروا کر دوسرے برادری کے درجنوں لوگ جیل میں بند کروا دیئے مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے خاموشی میں ہی آفیت جانی۔۔۔ وہی بوڑھا درویش جس کی وساطت سے یہ لوگ ایک خاص روحانی مقام تک پہنچے کو ان کے ایک معصوم بچے سمیت جیل میں ڈلوا دیا گیا اور اس کے گھر اور گھرانے کو تباہ کیا گیا۔۔۔ اس سازش کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کا پروموشن ہوا اور وہ پرنسپل کے عہدے پر ترقی پا کر دوسرے ضلع میں چلے گئے۔۔۔ بتاتی چلوں کہ یہ واقعات قبلہ نور الدینؒ کے وصال کے چند ہی ماہ بعد رونما ہوئے جس پر بہت سے لوگ حیران ہیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب جیسی ہستی نے ایسی گھناؤنی سازش کا ابتدا ہی سے پردہ چاک کیوں نہ کیا۔۔۔ یہ واقع تمہیں اس لئے سنایا کہ پروفیسر اللہ لوک کو شبنم اور شمع بھی اکثر ورغلاتی ہیں اور وقتی طور پر انہیں بعض باتوں کا یقین دلا کر ہی اٹھتی ہیں چونکہ ان کی موجودگی میں پروفیسر اللہ لوک کے قریب بیٹھے لوگ بھی شبنم اور شمع کی حمایت میں ہی بولتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ بعض ضرورت مندوں کو پروفیسر سے دور کیا جائے مگر پروفیسر پر اللہ کا خصوصی کرم و رحمت ہوتی ہے کہ وہ اس یقین کی کیفیت سے نکل آتے ہیں ورنہ ہیڈ ماسٹر صاحب جیسی بامشائدہ ہستی برادری ازم اور قبضہ گروپ کے چنگل میں پھنس کر ایک بڑی سازش کا حصہ بن گئی جس کی وجہ سے ایک وسیع خطہ زمین پر بسنے والے مسلمانوں کا امن تباہ ہوا اور کئی گھروں اور گھرانوں کے کفیل ایک سیاستدان کی سازش کا شکار ہو کر جیلوں میں بند ہو گئے۔۔۔ اچھا نبی یہ بتاؤ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اب بھی بامشائدہ ہیں۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ اس کا جواب صائمہ اور پروفیسر اللہ لوک ہی دے سکتے ہیں میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب واقعی بامشائدہ ہیں تو انہیں یہ معاملہ بھی حضور ﷺ کے اجلاس میں پیش کر کے سازشی سیاستدان اور ان کے مددگار ججوں، جرنیلوں اور دیگر ٹولے کو سزا کا حقدار ٹھہرانا چاہیئے۔۔۔ کیا ایک طالب حق کو اپنی روحانی قوت صرف پیر کا بخار دور کرنے کیلئے ہی استعمال کر کے اسے

اپنی کتاب میں درج کرنے کا ایک واقع تلاش کرنا ہی مقصود تھا۔۔۔نہیں ایسا نہیں۔۔۔ایک طالب اور ایک ولّی کا یہ کام نہیں۔۔۔وہ ہمیشہ سچ کا ساتھ دینے والا اور سچ کی خاطر تکالیف اٹھانے والا ہوتا ہے۔۔۔وہ برادری ازم کا پرچار کرنے والے ان پڑھ اور کرپٹ سیاستدانوں اور قبضہ مافیا کی مجلس سے دور بھاگتا ہے یا پھر انہیں اپنی توجہ سے دور کر دیتا ہے۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک بامشائدہ ولّی تھے۔۔۔اگر وہ اس سازش میں شریک نہیں تھے تو انہیں چاہئے تھا کہ وہ بوڑھے درویش کو اس کے خلاف ہونے والی سازشوں سے آگاہ کرتے اور عدالت میں جا کر ان کی بیگناہی کے متعلق بیان دیتے۔۔۔انہیں سیاستدانوں، وزیروں اور برادری کے غنڈوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ایک ولّی ایک طالب حق صرف اللہ سے ڈرتا ہے اور کوئی مادی قوت اسے حق اور سچ بات کہنے سے نہیں روک سکتی۔۔۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ ظہور مہدیؑ ایک راز ہے اور قدرت بھی اسے راز ہی رکھنا چاہتی ہے۔حضور قبلہ عالم مولوی محمد امین کشمیریؒ اکثر اپنے مریدین کو ظہور مہدیؑ کے متعلق کچھ باتیں بتاتے رہتے تھے۔آپ کے مریدوں میں ایک مرید جس کا نام غلام احمد عمہ تھا اور درزی کا کام کرتا تھا۔ایک دن اپنی دکان پر بیٹھے بیٹھے اس نے ظہور مہدیؑ کے متعلق کچھ باتیں کئیں اور اس کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ نکل گئے جو اس نے قبلہ پیر صاحب سے سنے تھے۔ان الفاظ کا تعلق راز سے تھا۔کچھ ہی دیر بعد ایک دیہاتی عمہ کی دکان پر آیا اور سرخ رنگ کے ایک کیمیکل کا ڈبہ عمہ کو دیا کہ وہ اسے اپنی دکان پر رکھ لے چونکہ دیہاتی کو بازار میں کچھ خریداری کیلئے جانا تھا۔۔۔عمہ حقہ پی رہا تھا کہ ایک چنگاری چلم سے اڑ کر ڈبے پر گری روز دار دھما کہ ہوا اور ڈبہ پھٹنے سے میٹل کا یک ٹکڑا عمہ کی شہ رگ کاٹ کر پار ہو گیا۔۔۔قبلہ نورالدین صاحب نے عمہ کے حادثے کی خبر مولوی محمد امین صاحبؒ کو پہنچائی تو آپ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ غلام احمد جنت میں ہے مگر ذراسی کوتاہی اسے حادثہ کا شکار کر گئی۔حضور قبلہ مولوی محمد امینؒ نے بھی افسوس کیا اور آئندہ ہر شخص کو ظہور مہدیؑ پر بحث سے منع کر دیا۔۔۔۔ یہ واقع سنانے کا مقصد روحانی رازوں پر بحث سے اجتناب کرنا ہے۔۔۔تم ہی نہیں بلکہ اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ پروفیسر اللہ لوک ولّی ہیں یا نہیں۔۔۔میں پھر کہونگی کہ یہ پروفیسر اور اللہ کا معاملہ ہے۔۔۔پروفیسر اللہ لوک خود بھی کسی ولائت کے دعویدار نہیں اور نہ ہی انہوں نے اپنی مارکیٹنگ کیلئے کوئی لابی تشکیل دے رکھی ہے۔۔۔کوئی پوسٹر اور کارڈ بھی نہیں چھپوایا اور نہ ہی اپنی تشہیر پسند کرتے ہیں۔۔۔پروفیسر اللہ لوک رزق حلال کماتے اور کھاتے ہیں اور اپنے ملنے والوں کو اسی کی تلقین کرتے ہیں۔۔۔دیکھو روحانیت کے بھی بہت سے راز ہیں جنہیں ہر کسی کے سامنے بیان کرنا حادثات کا موجب بن سکتا ہے۔۔۔اس لئے بار بار یہ پوچھنا کہ پروفیسر اللہ لوک کا روحانی مقام کیا ہے کسی طور درست نہیں۔۔۔پروفیسر اللہ لوک ہوں یا کوئی دوسرا ہمیں اس کی ظاہری حیثیت پر نظر رکھنی چاہیے کہ کیا وہ سچ کا ساتھ دیتا ہے۔۔۔امن کا داعی ہے۔۔۔انسانیت کا دکھ درد محسوس کرتا ہے۔۔۔رزق حلال کھاتا ہے۔غریبوں، مسکینوں اور مظلوموں کا حامی ہے۔۔۔اگر ایسا ہے تو وہ ایک اچھا آدمی ہے جس سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۷)

ہاں میں تمہیں غنی کشمیریؒ کے متعلق بتا رہی تھی۔ پورا نام ملا طاہر غنی کشمیریؒ لکھا جاتا ہے۔ تاریخ پیدائش اور وفات پر اختلاف ہے مگر ایک بات پر سبھی متفق ہیں کہ غنیؒ ایک باکمال شاعر تھا جس کا پیغام عالمگیر ہے جس سے ہر طبقہ فکر فیض یاب ہوسکتا ہے۔ غنیؒ مغل حکمران شاہجہان کے زمانے میں کشمیر میں شعر و ادب کا بادشاہ تھا جس کی درویشی اور فقیری کا چرچہ روم وایران تک تھا۔۔۔ صائمہ نے غنی کشمیری کے دیوان پر بھی کام کیا اور عشق کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر ملا محمد طاہر غنی کشمیری کو پڑھا اور غنی کی جرأت ایمانی پر پروفیسر اللہ لوک اور ان کے شاگردوں سے مقالمہ کیا۔۔۔ محمد امین دراب کشمیری کے مرتب کردہ دیوان جدید پر صائمہ کو کئی اعتراضات ہیں جنہیں پروفیسر اللہ لوک نے بھی درست تسلیم کیا اور صائمہ کے مودبانہ عشق اور عالمانہ جرأت کو پہلی بار داد دیتے ہوئے اسے آئندہ بغیر وقت لیے اپنے ہاں آنے کی اجازت دی جو پروفیسر اللہ لوک کے شاگردوں کے نزدیک ایک بڑا انعام ہے۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ غنی کشمیریؒ کے اشعار میں کونسی خصوصیت ہے جس پر صائمہ نے پروفیسر اللہ لوک سے انعام اور شاباش وصول کی۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ غنیؒ علامہ اقبالؒ کا روحانی استاد ہے۔۔۔ یوں تو علامہ مولانا رومؒ کو ہی اپنا مرشد مانتے ہیں مگر اقبالؒ نے خود اپنے روحانی سفر میں ملا طاہرؒ اور قراۃ العین طاہرہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جسے صائمہ آدھا سچ اور آدھا وہم کہتی ہے۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ وہ کیسے میں نے پوچھا۔۔۔ ملا طاہرؒ سے علامہ اقبالؒ کی ملاقات درست تسلیم کی جاسکتی ہے چونکہ ملا طاہرؒ اور اقبالؒ کی منزل ایک ہے۔ علامہؒ کے فارسی کلام میں بھی غنی کا رنگ جھلکتا ہے اور فلسفہ وسیاست کے اشعار و مضامین پر بھی غنی کی چھاپ لگی ہے۔ مگر طاہرہ کی کہانی ہی الگ ہے وہ خود راستے سے بھٹکی ہوئی تھی جس سے اقبالؒ کا اپنے روحانی سفر کے دوران ملنا ممکن نہیں۔ اقبال کا سفر عشق اگر عشق رسول ﷺ ہے تو طاہرہ کا عشق بہا اللہ کی قربت تھا۔۔۔ بہا اللہ چونکہ خود نبوت کا دعویدار تھا اور ایک نئے دین کا علمبردار بھی اس لئے طاہرہ اور طاہر کی وہ منزل نہیں جہاں اقبالؒ ان کی پرواز کا ذکر کرتے ہیں۔۔۔ طاہرہ کی پرواز ناسوتی اور کسی حد تک کمتر مجازی ہے جبکہ اقبالؒ کا شاہین، میاں محمد بخشؒ کا سیف الملوک اور ملا طاہر غنی کشمیری کا تخیل ملکوتی ہے۔۔۔۔ دنیا کے جس بھی کونے میں فارسی پڑھی، سمجھی اور بولی جاتی ہے وہاں ملا طاہر غنیؒ کا ذکر آج بھی بصد احترام کیا جاتا ہے جبکہ طاہرہ بہا اللہ کو کسی طور پر غنی کے برابر نہیں پرکھا جاسکتا۔ طاہرہ اپنے حسن و جمال اور بہا اللہ کی نبوت میں کھوئی رہی اور دین اسلام سے خارج ہوکر دنیا سے رخصت ہوئی جبکہ ملا طاہر قرآن کی تفسیر و معنی کو اپنے رسیلے شعروں میں ڈھال کر اہل علم کو قرآن فہمی کا درس دیتا ہوا اپنے ربّ کے حضور پیش ہوا۔ صائمہ کو اقبالؒ کے اس بیان پر بھی اعتراض ہے کہ انہیں عالم بالا میں اپنی علمی معراج کے دوران طاہر اور طاہرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔۔۔ صائمہ کہتی ہے کہ جب طاہر اور طاہرہ ایک منزل کے راہی ہی نہیں تو وہ ایک مقام پر اکٹھے کیسے ہوسکتے ہیں۔۔۔ مگر ہنی صائمہ کے ایسے اعتراضات پر اقبالؒ کے ماننے اور چاہنے والوں کی دل شکنی ہوگی اور لوگ صائمہ کے خلاف آواز اٹھائینگے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ کیوں اٹھائینگے۔۔۔ اگر اس قوم کو اقبال شناسی ہوتی تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔۔۔ دیکھو صائمہ نے ایک روحانی تخیلاتی نقطے پر اعتراض کیا ہے جسے سمجھنے کیلئے تزکیہ نفس اور مجاہدے کی ضرورت ہے جو پسر اقبال کو بھی میسر نہیں۔ جبکہ اقبالؒ شناسوں کے ہاں اقبالؒ کے وہی شعر مقبول ہیں جو الیکشن کے دوران بینروں پر یا پھر ٹرکوں کے پیچھے بنے عقاب کے پروں پر، نائی کی دکان پر اور جلسوں کے دوران کرپٹ لیڈروں کی آمد سے پہلے حاضرین جلسہ کو بٹھائے رکھنے کیلئے کرائے کے گویوں سے پڑوائے جاتے ہیں۔۔۔ جس قوم نے اقبالؒ کو فراڈ اور دھوکہ دہی کے لئے بلائے گئے جلسوں، حجاموں کے حماموں اور ٹرکوں اور چھکڑوں پر بنی تصویروں کی زینت بنا دیا ہو انہیں طاہر اور طاہر سے کیا واسطہ۔۔۔ یہی حالت قائداعظمؒ کی ہے۔ اب قائداعظم لیگ میں سارا مافیا اکٹھا ہوگیا ہے۔ چینی چور، سیمنٹ چور، سریا چور، پانی چور، ملاوٹ کرنے والے، جعلی دوائیاں بیچنے والے، کرائے کے قاتل، پلاٹ مافیا، بینک مافیا، سٹہ باز، بروکر اور پتہ نہیں کس کس قسم اور نسل کے لٹیرے قائد لیگ میں ہیں جن کا ذکر یکم جون 2006ء کی رات شیخ رشید نے شاہد مسعود کے شو میں کیا۔۔۔ شیخ رشید نے کیا کہا؟۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ شیخ کہتا ہے کہ ملک پر عملاً مافیا جات کی حکمرانی ہے جو حکمران اور اپوزیشن پارٹیوں کو کنٹرول کرتے ہیں اور دونوں جانب کے لیڈروں کو اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔۔۔ ایسی پارٹی جس پر مافیا کا کنٹرول ہو اسے مسلم لیگ اور قائد لیگ کہنا چودہ کروڑ مسلمانوں اور ان کے قائد کی توہین ہے۔۔۔ دیکھو ہنی یہ میکاولین سیاست ہے اور سیاسی پارٹی کا کچھ تو نام رکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ہاں۔۔۔ نام ضرور رکھنا چاہیے مگر کام کی نسبت سے نہ کہ دھوکہ دہی کیلئے۔۔۔۔ دیکھو نواز والوں نے مسلم لیگ ن رکھ لیا ہے۔ جبکہ دوسری پارٹی کوش، م یا پھر چ لیگ رکھنا چاہیے تھا۔ پارٹی میں قائداعظم کے کسی اصول پر عمل نہیں ہو رہا اور نہ ہی قائداعظم کا تعلق کبھی کسی سٹاک مارکیٹ، بینک، مل، کارخانے، پلاٹ مافیا یا پھر جوڑ توڑ اور برادری ازم کی سیاست سے رہا ہے۔۔۔ ق لیگ پر شوکت عزیز، چوہدری شجاعت اور مشرف صاحب کا کنٹرول

ہے۔شوکت صاحب جوکہ بنیادی طور پر بینکار ہیں ان کی بنیادی تربیت ہی منافع حاصل کرنا اور لوگوں کو قائل کرکے ان کی جیب سے پائی پائی نکال کر تجوری میں ڈالنا ہے جس کیلئے انہیں بینک مالکان، سٹاک مارکیٹ کے بروکروں، کارخانے داروں اور دیگر کاروباری لوگوں اور بڑے تاجروں کے ہاتھ مضبوط کرنے ہیں اور اس مشن میں وہ کامیاب جارہے ہیں۔۔۔تمہارا مطلب ہے کہ شوکت صاحب ہی پارٹی کے دل ودماغ ہیں اور ان ہی کے اصولوں پر پارٹی چل رہی ہے اس لئے پارٹی کا نام ش لیگ ہونا چاہیے۔۔۔ میں نے ہنی کو کہا۔۔۔تم ٹھیک سمجھے ہو۔۔۔پارٹی کا نام ش رکھ کر شوکت اور شجاعت صاحب سے نسبت دی جاسکتی ہے جو کہ اصل سچائی ہے۔۔۔مشرف لیگ بھی کہا جاسکتا ہے مگر مشرف محض ایک سائیہ ہے، پارٹی کی روح شوکت اور شجاعت ہیں اور انہیں کے اصولوں پر ق لیگ عمل پیرا ہے۔

ہنی شیخ رشید نے پارٹی پر مافیا کے قبضہ کا ذکر تو کیا ہے مگر مافیا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوئی تدبیر بھی بتائی ہوگی؟ شیخ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں۔۔۔ اب شیخ سچ ہی بولتا ہے مگر ضرورت کے مطابق۔۔۔ایسا سچ جو ضرورت کے مطابق بولا جائے وہ سچ نہیں ہوتا۔اسے دیسی زبان میں دل کا ساڑ کہتے ہیں۔وہ کیسے میں نے ہنی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔دیکھو یہ تو سچائی ہے کہ پارٹی پر مافیا قابض ہے چونکہ پارٹی حکومت کر رہی ہے۔۔۔تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ حکومت پر مافیا کا قبضہ ہے۔آج اگر حکومت مولانا فضل الرحمٰن کی ہوتو پھر بھی مافیا ہی کا قبضہ ہوگا چونکہ ان کی پارٹی میں بھی ق اور ن لیگیوں اور پیپلز پارٹی کی طرح پورا پوٹنشل موجود ہے جو مافیا کی مدد سے گڈ گورنس مہیا کر سکتا ہے۔۔۔مولانا صاحب کی سیاسی طبیعت کافی سلپری ہے اور ایسی طبع والوں کا کوئی ایک طبیب نہیں ہوتا۔۔۔مولانا کافی عرصہ بینظیر اور نواز شریف کی شاگردی میں رہ چکے ہیں اور کل مُکلِے کئی بار یورپ کا دورہ بھی کرتے رہے ہیں۔۔۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔مولانا کوئی بچے ہیں کہ اکیلے یورپ جاکر ڈرتے رہے ہونگے۔میں نے پوچھا۔۔۔فرق پڑتا ہے ہنی بولی۔۔۔خاص کر یورپ کے دورے پر۔۔۔وہاں مافیا والے ہوتے ہیں جو بندے کو اللہ کا بندہ نہیں رہنے دیتے۔۔۔وہ کیسے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔وہ لیڈر کی قیام گاہ کو مصنوعی جنت میں بدل دیتے ہیں اور اگر لیڈر مولوی ہوتو اسے ہر طرف حور وغلامان کی تصویریں نظر آتی ہیں اور اکثر یہ حوریں ہاتھ پکڑ کر لیڈروں کو جنت کی سیر پر نکل جاتی ہیں۔اس مدہوشی میں کچھ لیڈر ہوٹل کا بل دیئے بغیر ہی چلے آتے ہیں۔۔۔پھر میں نے پوچھا۔۔۔پھر کچھ بھی نہیں۔۔۔اللہ کا بندہ مافیا کا بندہ ہوجاتا ہے اور مافیا والے اس کے سیاسی، سازشی، سیاحتی، سفارتی اور صحافتی اخراجات برداشت کرتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر اسے کسی اچھی سیٹ پر ایڈ جسٹ کرکے اربوں روپے عوام کی جیبوں سے نکال کر اپنی اپنی جیبوں میں لے جاتے ہیں۔۔۔اس ساری کاروائی میں لیڈر یا بندے کا کیا رول ہوتا ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔خاموشی۔۔۔ہنی بولی۔۔۔جس طرح شیخ رشید صاحب سچائی والے اور ان کے پارلیمانی دوست چینی اور دیگر اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر خاموش رہے اور وزارت بدلنے پر سچ بول دیا کہ پارٹی پر مافیا کا قبضہ ہے۔۔۔اگر سچ بولنا تھا تو اسمبلی میں کھڑے ہوکر بولتے۔مافیا کے ممبروں کا نام لیتے۔بابر اعوان اور ایس ایم ظفر کو مفت وکیل کرتے اور مافیا والوں کو سپریم کورٹ میں لا کھڑا کرتے اور اگر عدالت فیصلہ نہ کرتی تو استعفیٰ دے کر سونیا گاندھی کی طرح پھر الیکشن لڑتے تب میں مانتی سچ بول رہے ہیں۔۔۔ہنی اس طرح تو انہیں ریلوے کی وزارت بھی نہ ملتی۔۔۔میں نے کہا۔۔۔نہ ملتی تو نہ سہی۔۔۔اس سے کیا فرق پڑتا۔۔۔وہ اللہ کے بندے تو رہتے۔ہنی نے کہا۔۔۔پھر۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔مجھے پورا یقین ہے کہ چیف جسٹس آف پاکستان چودہ کروڑ پاکستانیوں کے حق میں فیصلہ دیکر نہ صرف عدلیہ کا سر اونچا کردیتے بلکہ شیخ رشید پاکستانی سیاست کے شہنشاہ بن جاتے۔۔۔مگر ہنی اگر شیخ صاحب مقدمہ جیت جاتے تو ساری جاٹ سبھا اور ان کے درباری ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سیاست سے آؤٹ اور آدھے سے زیادہ جیل چلے جاتے۔اس طرح اسمبلی اور سینٹ میں انیسہ زیب، ایس ایم ظفر، شیخ رشید، عمران خان اور قاضی حسین احمد کے علاوہ پندرہ بیس بندے ہی رہ جاتے باقی تو سب کی چھٹی ہوجاتی۔۔۔اچھا نہ ہوتا۔۔۔مشرف صاحب آزاد ہوجاتے اور آرام سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں آجاتے۔۔۔ہنی نے کہا۔۔۔دیکھو ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے اگر قانون اپنے زور پر عدل کے ترازو میں تول کر یہ کردے تو قوم کسی بڑے امتحان اور خوفناک طوفان سے بچ جائے گی۔ورنہ نام نہاد لیڈروں اور دولت کے پوجاری سیاستدانوں کے گناہوں کا کفارہ بیچارے عوام کو بھگتنا پڑے گا جیسے کشمیری، افغانی اور عراقی عوام بھگت رہے ہیں۔صائمہ کہتی ہے کہ اگر اس قوم نے ملک میں موجود اور جلاوطن قیادت بشمول مولویوں اور نام نہاد کرائے کے دانشوروں کو یکسر مسترد نہ کیا تو وہ ذلت کی گہرائیوں میں دفن ہوتے جائینگے اور ان کی ہستی ہی مٹ جائے گی۔۔۔صائمہ کی اس پیشگوئی پر پروفیسر اللہ لوک کیا کہتے ہیں۔۔۔اللہ لوک اور ان کی پارٹی کو اس کی پروہ نہیں۔۔۔وہ داتا صاحبؒ کی طرح مستی میں ہیں۔۔۔ایک بار صائمہ کچھ اداس تھی مگر پروفیسر اللہ لوک اس دن بہت خوش تھے۔صائمہ چاہتی تھی کہ اس کی اداسی سب پر اثر کرے اور وہ غمزدہ ماحول سے فائدہ اٹھا کر اپنا دکھ بیان کرے مگر پروفیسر اللہ لوک نے صائمہ کی اداسی اور غم کو یکسر مسترد کرتے ہوئے شمع اور شبنم کو بلا لیا۔۔۔ پھر۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔شبنم نے پروفیسر اللہ لوک سے پوچھا کہ مال بٹورنے اور امیر ہونے کا کوئی وظیفہ یا طریقہ بتائیں تاکہ گھوم پھر کر ذلت کی کمائی سے بچا جائے۔۔۔ ہنی تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ایسی بیہودہ کلام بھی لوگ کرتے ہیں۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ہر دربار پر ایسی خواتین، مرد، پولیس والے، عدل کرنے والے، چور، قاتل، لٹیرے، وزیر، امیر، سمگلر بلکہ ہر قماش کے لوگ جاتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔۔۔ڈاکو کامیاب ڈاکے کی منت مانتا ہے اور پولیس والے بڑی آسامی کو قابو کرنے کی۔۔۔ہیرامنڈی والی زیادہ گاہک آنے کی اور وزیر نئی سکیم کامیاب ہونے اور بل پاس ہونے کی۔۔۔سمگلر اپنا مال بحفاظت منزل پر پہنچنے کی اور بڑا افسر زیادہ مال ہڑپ

کرنے کی۔۔۔دیکھو بھائی۔۔۔اس ملک میں ہر ایک واردات کرنے اور کامیابی سے نکل جانے کے چکر میں ہے۔۔۔چاہے وہ ٹیلی ویژن پر بیٹھا تلقین شاہ ہو یا مسجد میں سر گھٹنوں میں دابے مراقبے کی حالت میں مُلا۔پھٹیچر بس میں بیٹھے عام مسافر اور سبز ہلالی پرچم والی ائیر کنڈیشنڈ لینڈ کروزر میں بیٹھے وزیر کی ایک ہی آرزو ہے کہ کسی طرح لمبا ہاتھ پڑے اور ایک ہی واردات میں کام تمام ہو جائے۔۔۔پھر۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔پھر کچھ بھی نہیں۔۔۔ہر کوئی اپنی اپنی اسطاعت کے مطابق لگا ہوا ہے۔کسی کی دعا قبول ہو رہی ہے اور کسی کی نہیں۔۔۔دیکھو میاں۔۔۔جب قوم ہجوم بن جائے اور کام کر کے ترقی کرنے کے مواقع ختم ہو جائیں تو پھر لوٹ مار، افراتفری، لاقانونیت اور بربریت کے راستے خود بخود کھل جاتے ہیں۔جس ملک میں وزیر اعظم، وزیر خزانہ اور معیشت دان صرف دال کی قیمت دو روپے کم کرنے پر صدر اور کابینہ سے مبارک باد وصول کر کے فخر سے اپنا سر بلند کرتے پھریں اس ملک کے عوام کیلئے سوائے مایوسی کے اور کونسا راستہ رہ جاتا ہے۔۔۔تم صائمہ اور شبنم کی بات کر رہی تھی۔۔۔میں نے ہنی سے پوچھا۔۔۔دراصل صائمہ کے غم اور شبنم کی خواہش ایک ہی طرح کی تھیں۔وہ جسے کھو دینے کے غم میں تھی شبنم اسے پانے کا گُر پوچھ رہی تھی۔جب ماحول میں یکسانیت ہو تو اس میں صائمہ ہو یا شبنم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔البتہ پروفیسر اللہ لوک کی خوشی نے دونوں کی خواہش کو زائل کر دیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔۔۔پروفیسر کس بات پر خوش تھے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔قرض کے بوجھ سے نجات پر۔۔۔کچھ دنوں سے پروفیسر اللہ لوک پریشان تھے۔۔۔نہ نیند آتی تھی۔نہ سکون میسر تھا۔۔۔صائمہ نے آنا بھی بند کر دیا تھا اور شبنم اپنی سہیلیوں کے ہمراہ کثرت سے آنے لگی تھی۔شبنم جاتی تو کوئی نہ کوئی پولیس والا یا وزیر آ جاتا۔۔۔پروفیسر اللہ لوک سے بدعائیں کروانے والوں کا اس قدر رش ہوا کہ پروفیسر کے برآمدے کے ستون لرزنے لگے۔۔۔ہنی تم پھر بھول رہی ہو۔۔۔کچھ روز پہلے تم نے کہا تھا کہ طالب حق چاہے کسی بھی درجے کا ہو وہ بددعا نہیں کر سکتا۔۔۔اب تم بیان بدل رہی ہو کہ لوگ پروفیسر اللہ لوک سے بدعائیں کروانے آتے ہیں۔۔۔میں نے ہنی کو روکتے ہوئے کہا۔۔۔میں بیان بدل نہیں رہی بلکہ تم سمجھ نہیں رہے۔۔۔دیکھو اگر کوئی لڑکی اس خواہش سے آئے کہ اللہ اسے نیک دیندار اور رزق حلال کمانے والا شوہر عطا کرے، عورت نیک اور صالح اولاد کی تمنا کرے، طالب علم محنت کے بعد علم میں اضافے اور کامیابی کا طالب ہو، تاجر جائیز منافع کی تمنا کیساتھ برکت کا خواہش مند ہو، حاکم اور جج خوف خدا کیساتھ فرض کی بجا آوری چاہتا ہو تو اسے دعا کہتے ہیں اور اللہ ایسی دعائیں قبول کر کے قوموں کو سچے قائدین کی رہنمائی میں عروج بخشتا ہے۔مگر یہاں بلکہ کسی بھی مسجد، مندر، معبد، گرجے، خانقاہ اور آستانے پر ایسی خواہشات والے کم ہی آتے ہیں۔ہر کوئی اپنی واردات کی کامیابی کیلئے آتا ہے تاکہ وہ کسی طرح دوسرے کی جیب صاف کرے، مال ہڑپ کرے، قومی خزانہ لوٹے، دوسروں کو نیچا دکھائے، انکی ذلت ورسوائی پر جشن منائے، اپنے عیش وآرام کی خاطر دوسروں کا سکون اور امن برباد کرے، لڑکیاں امیر کا لڑکا اور لڑکے امیروں کی لڑکیاں پھنسانے کا وظیفہ مانگتے ہیں۔پولیس والے آؤٹ آف ٹرن پروموشن اور زیادہ کمائی والا اسٹیشن اور وزیر وزارت کی سلامتی اور کمائی میں اضافے کے خواہش مند ہیں۔آپ خود ہی بتاؤ یہ سب دعائیں ہیں یا بدعائیں۔۔۔کونسا ولی اللہ چندلوگوں کو وظیفہ اور دعا دیکر سارے ملک کو لوٹنے اور تباہ کرنے کا مشورہ دے گا۔۔۔تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں عمہ کشمیریؒ کی مثال دی تھی کہ ایک با مشاہدہ ولی ذراسی غلطی پر پکڑ میں آجاتا ہے۔اب تم پوچھو گے کہ ملک کے طول وعرض میں گدی نشینوں، پیروں، مخدموں اور صاحبزادوں کے ہزاروں لنگر خانے اور دربار چل رہے ہیں تو بھیّا یہ سب دکانداری ہے فقیری نہیں۔۔۔تو پھر پروفیسر اللہ لوک کیا کرتے ہیں۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔وہی جو داتا صاحبؒ، بھٹائی صاحبؒ، لونگ صاحبؒ، کاکا صاحبؒ، عبداللہ شاہ غازیؒ، نورالدین صاحبؒ اور امین صاحبؒ کرتے رہے ہیں۔۔۔کیا کرتے رہے ہیں مجھے اس کی سمجھ نہیں۔۔۔دیکھو۔۔۔ہنی بیگم بولی۔۔۔فقیر کسی کو اپنے در سے دتکارتا نہیں۔۔۔فقیر کا اصول اور طریقہ پیار اور محبت کا طریقہ ہے۔۔۔وہ ہر مذہب ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں سے ملتا ہے۔۔۔فقیر کی پرکھ یہی ہے کہ جو اسے ملے اپنے دل کی بات کہے اور جب اٹھے تو فقیر کو اپنا سمجھے۔۔۔فقیر تدبیر کے ساتھ اُنس اور پیار کے نشتر سے دل کی صفائی کرتا ہے۔۔۔جو جلدی میں ہوتا ہے وہ جلد ہی اٹھ جاتا ہے اور واپس نہیں آتا اور جس کے دل پر نشتر چل جائے وہ جاکر پھر آجاتا ہے۔پروفیسر اللہ لوک سب کی سنتے ہیں اور کسی کو دتکارتے نہیں۔۔۔وہ تدبیر کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور وظیفے کے ساتھ نماز اور طہارت کی شرط باندھ دیتے ہیں۔۔۔وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ نماز اور پاکیزگی کے بغیر وظیفہ کام نہیں کریگا۔۔۔پھر۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔پھر بندہ اور اسکا ربّ ہم کلام ہوتے ہیں۔۔۔بندہ پانچ وقت ربّ کے سامنے حاضری دیکر اور اس کے بابرکت اور بلند تر ناموں کا واسطہ دیکر اس سے مانگتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ تو مل ہی جاتا ہے۔۔۔اور کچھ نہیں تو اسے سمجھ ضرور آجاتی ہے اس کا معاملہ کہاں اٹکا ہوا ہے۔۔۔صائمہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔۔۔وہ معاملات میں الجھ کر خواہش کے دریا میں بہہ جاتی ہے مگر ہے   لکی۔۔۔فوراً چیخ کر پروفیسر کو مدد کیلئے بلا لیتی۔۔۔شبنم، شمع اور ان کی سہیلیوں کا معاملہ پولیس والوں، وزیروں، مشیروں، سیاستدانوں اور سرمائیہ داروں والا ہے۔۔۔یہ لوگ مرنے سے ایک گھنٹہ پہلے اللہ سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ جنت کے معاملے پر بات چیت کر کے مسئلہ حل کر لیا جائے۔۔۔باقی زندگی یہ بدعاؤں کے سہارے عیش موج کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ لوگ ان کی زندگیوں پر رشک کریں اور یہ لوگوں کے سینوں پر رقص کر کے بادشاہوں کی طرح جئیں۔۔۔اچھا یہ بتاؤ پروفیسر اللہ لوک اس دن خوش کیوں تھے۔۔۔کہا ناں قرض ادا ہو گیا تھا۔۔۔دیکھو۔۔۔نیچے دودھ دہی والا ہے ناں۔۔۔ہاں ہے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔پروفیسر نے اس سے بیس روپے ادھار لیے تھے۔کافی دنوں بعد ان لوگوں نے پروفیسر کو بھرے بازار میں پکڑ کر ادھار واپس کرنے کی آخری وارننگ

دے دی۔۔۔ پھر۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ پروفیسر دوڑے دوڑے گھر گئے اور بیس روپے واپس کر کے تاخیر کی معافی بھی مانگی۔۔۔ یہ تو معمولی سی بات ہے۔۔۔ نہیں یہ معمولی نہیں بلکہ بڑی بات ہے۔۔۔ صوفی نورالدینؒ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔۔۔ اگر ہمارے ملک میں ہر شخص اپنی غلطی کا احساس کرے۔۔۔ تلخی کو بُھلا کر نرمی سے پیش آئے۔۔۔ دوسروں کا حق نہ کھائے۔۔۔ محنت کی کمائے اور حلال کر کے کھائے تو سارے معاملات ہی حل ہو جائیں۔۔۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ نہ پیر خود کماتا ہے نہ مرید حلال کھاتا ہے۔۔۔ پیر بھی لوٹتا ہے وزیر بھی لوٹتا ہے تو امن، برکت، خوشحالی اور خوش اخلاقی کہاں سے آئے۔ یہی حال عدالتوں اور مسجدوں کا ہے۔ جج عدالت میں بیٹھ کر ناانصافی کرتا ہے اور مولوی نے مسجد کو سیاسی اکھاڑہ بنا دیا ہے۔۔۔

اگر ہر شخص اپنا محاسبہ کرے تو ملک سے ناانصافی، غربت، احساس محرومی، اور حکمران طبقے کی عیاشی کا خاتمہ ہو جائے۔۔۔ صائمہ کہتی ہے کہ اس دن پروفیسر اللہ لوک نے اس کے غم میں شرکت نہ کر کے اس پر احسان کیا ہے ورنہ وہ ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ اسے بعد میں احساس ہوا کہ وہ جسے غم سمجھ رہی تھی وہ احساس ندامت تھا۔ پروفیسر اللہ لوک کی خوشی فرض کی ادئیگی پر راحت وسکون کی تھی جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ اگر پاکستانی عوام سکون اور راحت کی اس لہر سے لو لگالیں تو ان کے مسائل حل ہو جائیں۔ نہ دینی جماعتیں، نہ سیاسی جماعتیں اور نہ جرنیلی جمعیتیں ان پر حکمرانی کرینگی اور نہ ہی واشنگٹن والا بابا ان کی تقدیر سے کھیلے گا۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوا تو۔۔۔ میں نے ہنی سے پوچھا۔۔۔ پھر شبنم، شمع، سارا، اور سیما کا مستقبل روشن ہوگا۔ دعائیں بدعائیں بن جائینگی، احساس محرومی بڑھتا جائے گا، پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے ڈاکو ہونا اور اسمبلی ممبر کے لیے کرمنل ہونا ضروری ہوگا۔ اس سال دال بجٹ پیش ہوا ہے اگلے سال پانی پر اور پانچویں سال اگر شوکت صاحب کی صحت ٹھیک رہی تو آکسیجن پر ٹیکس کا بجٹ پیش ہوگا تاکہ کوئی غریب اور متوسط پاکستانی مفت سانس بھی نہ لے سکے۔ پروفیسر اللہ لوک کیا کہتے ہیں۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ کہہ چکی ہوں ناں کہ وہی کہتے ہیں جو داتا صاحبؒ بھٹائی صاحبؒ اور دوسرے کہہ گئے ہیں کہ جو اپنی تقدیر نہیں بدلتا اللہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ غنیؒ نے بھی یہی کہا اور سعدیؒ بھی یہی کہہ گئے کہ لومڑی نہ بن شیر بن خود بھی کھا اور دوسروں کو کھلا۔ ڈاکو نہ بن مزدور اور محنت کش بن۔ خلیل جبران بھی یہی کہہ گیا۔ سعدیؒ کی قوم نے دیر سے سہی مگر بات سمجھ لی ہے اور آج وہ خلیل جبران کی قوم کے سامنے آہنی دیوار بن گئی ہے۔ بھٹائیؒ اور غنیؒ کی قوم نہیں سمجھی اور خستہ حال ہے۔۔۔ جو قوم کھمبوں، چوھدریوں اور مولیوں سے امیدیں لگالے اسے راحت نصیب نہیں ہوگی۔۔۔ میں تمہیں غنی کشمیری کے متعلق بتا رہی تھی۔۔۔ وہ ہر عہد کا شاعر ہے۔۔۔ اس کے شعروں میں پیشگوئیاں ہیں۔۔۔ بڑی رمز کی باتیں ہیں۔۔۔ بڑی گُر اور ہنر کی دلیلیں ہیں۔۔۔ جنرل مشرف اگر صائمہ سے غنیؒ کے دیوان پر مکالمہ کر لیتے تو انھیں چوہدریوں، مولیوں، اور کھمبوں کی سیاست سمجھ آجاتی۔ جن مولویوں نے اپنے پیش امام جناب قاضی صاحب کو بدل کیا ہوا ہے انھیں قاضی سے توڑ کر چوھدری سے جوڑنا کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔۔۔ چوھدری، مولوی اور کھمبا ایک ہی چیز ہیں اور تین کونوں میں کھڑے ہیں۔۔۔ چوتھا کونا جان کر خالی چھوڑ دیا گیا ہے جہاں کچھ عرصہ کے لئے جرنیلوں کو کھڑا کر کے یہ تینوں اپنی خجالتیں اور ندامتیں جرنیلوں کے نام کر دیتے ہیں۔۔۔ جنرل مشرف صائمہ سے دیوان غنیؒ پر بات کر لیتے تو ان کے لئے اچھا تھا۔۔۔ صائمہ کے پاس جنرل مشرف کے لئے کونسا پیغام ہے جو غنیؒ کے دیوان سے اس نے اخذ کر رکھا ہے۔۔۔ میں نے ہنی سے پوچھا۔۔۔ غنیؒ کے دو شعر ہیں اگر جنرل مشرف سمجھ جائیں تو۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ شعر فارسی میں ہیں جنکا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ اے نادان تو اپنے دشمن کی کمزوریوں پر غافل نہ رہ۔ دریا کا پانی دیوار کے پاؤ چومتا ہے مگر آخر کار اسے گرا دیتا ہے۔

۲۔ اے بادشاہ غور سے سن۔ جن پر تو نے احسان کیا انھیں اپنے سے دور کر دے اور جو تیری خوشامد کرے تو اس سے دور ہو جا۔ ایک ہی قبیلے کے محافظ تیری حفاظت پر مامور ہوں تو سمجھ لے تو بے حفاظت ہو گیا۔۔۔

شعر تو اچھے ہیں مگر صائمہ کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے محمد علی درانی یا پھر کشمالہ طارق ان کی تشریح کر دیں۔۔۔ ویسے جنرل صاحب خود بھی سیانے آدمی ہیں ترکی کی طرح انھیں فارسی کی سُدھ بُدھ بھی ضرور ہوگی۔

ہنی مجھے تین باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ پہلی بات یہ کہ تم اکثر سولہ کروڑ عوام کا ذکر کرتی ہو جبکہ مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی کچھ اور ہی ہے چونکہ پینتیس، چالیس لاکھ آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔ دوسری بات صائمہ کی اداسی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ اکثر اداس اور غمزدہ ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی اداسی اور غم میں سارا ماحول شریک ہو۔۔۔ آخر کیوں؟۔۔۔ وہ کونسا غم ہے جو سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہے۔ ویسے ہی آج کل ہر شخص پریشان ہے۔ اس ملک میں صرف غنڈوں، بدمعاشوں، نو دولتیوں، سیاستدانوں، افسروں، اور ان کے جان پہچان والوں کے ہی حقوق ہیں۔ ملکی قانون اور عدالتیں اسی طبقے کی سنتی ہیں اور ہر فیصلہ ان کے حق میں ہوتا ہے۔ غریب اور سفید پوش طبقہ پہلے ہی غلامانہ زندگی جی رہا ہے۔ اگر غلطی سے کوئی شخص تھانے کچہری یا پھر عدالت میں انصاف مانگنے چلا جائے تو وہ زندگی بھر وہاں سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر آپ غنڈے اور بدمعاش کو ووٹ دیں تو وہ اسمبلی میں جا کر ملکی سطح پر غنڈہ گردی کرتا ہے۔ وزیر بن کر قومی خزانہ لوٹتا ہے۔ مصنوعی مہنگائی اور ذخیرہ اندوزی سے عوام کا خون چوستا ہے۔ پولیس پٹواری اور عدالتوں کے ذریعے قبضہ گروپ تشکیل دیتا ہے اور لوگوں کو دربدر کر کے اپنے پلازے، پٹرول پمپ، گیس سٹیشن، مارکیٹیں اور ہاؤسنگ سکیمیں بناتا ہے۔ اگر ووٹ نہ دو تو غنڈوں اور قاتلوں سے قتل کروا دیتا ہے۔ جیلوں میں سڑ سڑ کر مرنے کی سزا دلواتا ہے اور گھروں سے ذلت و رسوائی کے ساتھ بے دخل اور بے گھر کروا دیتا ہے۔ پہلے اس طبقے کی تعداد کم تھی اب مشرف صاحب نے اسمبلی اور سینٹ کی سیٹیں بڑھا کر اور نئے پولیس اور ضلعی حکومتی نظام کے تحت اس اشرافیہ میں اضافہ کر دیا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ سمگلر، نو دولتیے، غنڈے، بدمعاش، ذخیرہ اندوز اور کمیشن ایجنٹ اپنی قوت اور دولت کا مظاہرہ کر کے حکومت کا حصہ بن جائیں اور انہیں آئینی تحفظ اور حفاظت میسر ہو۔

پہلے غم تھوڑے ہیں کہ لوگ صائمہ کے غم کا ماتم کرنے بیٹھ جائیں۔ مجھے تو صائمہ اچھی بھلی لگتی ہے۔ بس ایک نظر میں دیکھی تھی مگر پوری طرح صحت مند اور فٹ تھی جیسے ابھی ابھی اسمبلی کے اجلاس سے واپس آئی ہو۔ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے تک پہنچنے کیلئے پچھتر سیڑیاں چڑھنا پڑتی ہیں اور اچھے بھلے آدمی کا سانس پھول جاتا ہے مگر صائمہ بیگم شیریں رحمان اور کشمالہ طارق کی طرح ہشاش بشاش اور سیاسی لحاظ سے فریش تھی۔ قسور خان خلیفہ کو بتا رہا تھا کہ صائمہ کے پاس نئی گاڑی ہے اور مال و دولت کی بھی کمی نہیں تو پھر غم کس چیز کا ہے۔۔۔ اچھا تم تیسرا سوال بھی کرو۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ تیسرا سوال تین حصوں پر مشتمل ہے۔۔۔ 2 جون 2006ء کو **آج** ٹیلی وژن پر مشاہد حسین سیّد نے اپنے چکوالیے بھرا طلعت حسین کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ جمہوریت کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے جبکہ صائمہ نے سیما کو کہا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت سمندر کے کھارے پانی میں دو بوند دودھ مکس کرنے یا پھر دودھ میں مینگنیاں ڈالنے کے مترادف ہے۔ مشاہد حسین نے یہ بھی کہا ہے کہ عوام کے فیصلے کے بعد ہم جنرل مشرف کی قیادت میں تھری پرانگ یعنی تین شاخہ حملہ کرینگے جسے انہوں نے تھری ایز (EEE) کا نام دیا ہے۔ مشاہد حسین کے مداحوں کا کہنا ہے کہ وہ اب ہر حکومت کی ضرورت بن گئے ہیں۔ مشاہد حسین لندن، واشنگٹن، دہلی، ماسکو، بیجنگ اور دبئی کے ساتھ ہمہ وقت رابطے میں رہتے ہیں اسلیے ان کی موجودگی میں پاکستان میں کسی تھنک ٹینک کی ضرورت نہیں۔ مشاہد صاحب اڑتا پھرتا ٹینک ہیں جسے بے وردی اور باوردی قیادت اپنی مرضی ومنشاً سے پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں، سمندروں، دریاؤں اور فضاؤں میں استعمال کر سکتی ہے۔ وہ ایک دانشور، صحافی، پارلیمنٹیرین، گشتی سفارتکار اور سیاستدان ہی نہیں بلکہ اندرون خانہ تاریخ دان بھی ہیں۔ مشاہد حسین ضیائی دور کی پیداوار ہیں جنھیں نواز شریف اور بینظیر کے ساتھ کام کرنے کا وسیع تجربہ حاصل ہے جسے اب وہ مشرف صاحب پر آزما رہے ہیں۔ اگر مستقبل قریب میں مشرف مولانا فضل الرحمٰن اتحاد بن گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ فضل الرحمٰن کی کابینہ میں بھی وزیر اطلاعات ونشریات یا پھر وزیر خارجہ بن کر قوم کا مزید بھرکس نکالنے کا فریضہ سرانجام دیں۔ میرے تیسرے سوال کا دوسرا حصہ وہاب الخیری ایڈوکیٹ کا انٹرویو ہے جو انہوں نے نعیم بخاری کے شو "اپنے اپنے انداز میں" **ھم** ٹیلی وژن" پر سولہ اپریل 2006ء کی رات دس بجے سے گیارہ بجے دیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے شمس الرحمٰن بنام کیپٹن ریٹائرڈ گوہر ایوب ولد محمد ایوب آف ریحانہ ضلع ہری پور کے خلاف ایف آئی آر کا ذکر کیا جس کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں معلق ہے۔ یہ مقدمہ فاطمہ جناح اور جنرل ایوب کے مابین صدارتی الیکشن کے دوران فائل ہوا تھا مگر تاحال فیصلے کا منتظر ہے۔ وہاب الخیری نے اسی انٹرویو کے دوران گوہر ایوب کے عزیز رشتہ دار جنرل علی قلی خان خٹک کا بھی ذکر کیا اور ایک ایسا الزام لگایا جس کی بنا پر جنرل صاحب کو یا پھر وہاب الخیری کو جیل میں ہونا چاہئے۔ وہاب الخیری نے یہ بھی کہا کہ اگر الزام جھوٹا ہو تو وہ جیل جانے کو تیار ہیں۔۔۔ بس تمہارے سوالات اتنے ہی تھے۔۔۔ ہاں اتنے ہی۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ تمہارا پہلا سوال صائمہ کے متعلق ہے جسکا جواب میں دونگی جبکہ دیگر سوالات کے جواب بھی مجھے یاد ہیں چونکہ ان پر صائمہ نے پروفیسر اللہ لوک کے سینئر طلباء کو باقاعدہ لیکچر دیا تھا اور اسپر خوب بحث ومباحثہ ہو چکا ہے۔۔۔ اچھا ہنی اس سے پہلے کہ تم صائمہ کے دکھی ہونے کے متعلق بتاؤ۔ آبادی والا جواب بھی دے دو۔۔۔ ہاں صائمہ کہتی ہے کہ وزیر داخلہ آفتاب احمد خان شیر پاؤ نے ایک دن بتایا کہ یہ سولہ اٹھارہ کروڑ آبادی والا ملک ہے مسئلے مسائل تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ واقعہ کسی کانفرنس یا پھر پریس کانفرنس کا ہے چونکہ ایسے مواقع پر خان صاحب کے منہ

سے غیرارادی طور پر سچ نکل جاتا ہے۔ایسی ہی محفل میں ان کے منہ سے سچ نکل گیا تو انہوں نے سوال کرنے والے پر الٹا سوال کر دیا کہ پاکستان کی آبادی کتنی ہے۔سوال کرنیوالے نے کہا چودہ کروڑ۔خان صاحب نے پوچھا25 سال پہلے کتنے افغان مہاجر پاکستان آئے تھے تو اس نے کہا جناب تیس لاکھ۔واپس کتنے گئے ہیں؟ جواب ملا آپ کے مطابق بیس لاکھ۔ایک افغان اوسطاً کتنے بچے پیدا کرتا ہے۔چارسدہ کے خان نے پوچھا۔۔۔بیس سے پچیس۔۔۔پھر سوال آیا اب تک کتنی نسلیں پاکستان میں پیدا ہو چکی ہیں۔سوال کرنے والے نے کہا دو۔تو اس حساب سے کتنے افغان پاکستان میں موجود ہیں۔خان صاحب نے پھر پوچھا۔جناب تقریباً دو سے اڑھائی کروڑ۔بات افغانوں کی ہوتی تو تھم جاتی مگر بات مہاجروں کی تھی اور یہ زندگی کا دوسرا حساب تھا جو خان صاحب نے خود لگایا تھا اس لیے وہ پھر سوال کرنے والے پر حملہ آور ہوئے اور پوچھا۔اچھا یارا تمہیں کراچی کا معلومات ہے۔سوال کرنے والے نے کہا جی خان جی تھوڑا بہت ہے۔تو پھر یہ بتاؤ ہر سال بھارت سے کتنے معاشی مہاجر کراچی،حیدرآباد اور ملتان تک آکر غائب ہو جاتے ہیں۔بیچارے سوال کرنے والے نے کہا جناب صحیح معلومات تو الطاف بھائی کو ہونگی مگر ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ لوگ بھارت اور بنگلہ دیش سے آتے ہیں اور آدھے سے زیادہ غائب ہو جاتے ہیں چونکہ اب کراچی سمندر کے کنارے انسانوں کا سمندر بن گیا ہے۔۔۔اب حساب کر کے بتاؤ پاکستان کی آبادی کتنی ہے۔سوال کرنے والے نے اجازت کے ساتھ معافی بھی مانگی اور چلتے وقت کہا کہ جناب اسطرح تو بیس کروڑ بن جاتی ہے۔ہنی خان صاحب نے پہلا درست حساب کونسا لگایا تھا۔پانچ کروڑ سٹرلنگ پونڈوں کا۔۔۔یہ پہلا سچ تھا جو خان صاحب کے منہ سے نکل گیا تھا کہ بُرے وقت کے لئے انسان کچھ نہ کچھ تو بچا کر رکھتا ہے۔میں نے بھی پانچ کروڑ پاؤنڈ ولائت بھجوائے ہیں تو کیا بُرا کیا ہے۔اسی لئے شائد نیب والوں نے انہیں سچ بولنے پر چھوٹ دے دی ہے۔چلو آبادی والا مسئلہ تو حل ہو گیا جسکا کریڈٹ شیر پاؤ صاحب کو جاتا ہے اب صائمہ کے غم کی طرف آؤ چونکہ یہ بھی قومی مسئلہ ہے۔۔۔میں نے کہا۔۔۔یہ غم ہر کسی کا ہے مگر کم لوگ ہی اسکا اظہار کرتے ہیں۔دھوکہ دہی،فراڈ،جھوٹ،بے ایمانی،بددیانتی،بدمزاجی،بداخلاقی،بدکرداری بلکہ ہر بدی ہماری سیاسی،سماجی،اور معاشرتی زندگی کا حصہ ہے۔یہ سب کھمبا سیاست اور جاہلیت کی وجہ سے ہے جسکے بانی ہر سیاسی اور دینی پارٹی میں موجود ہیں۔پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی نسبت زیادہ موثر جھوٹ بولتے ہیں اور یہ کردار بہتر انداز میں ادا کرتے ہیں۔اب تو حکومت نے اسمبلی ممبران کے لیے گریجویشن کی حد مقرر کر دی ہے تا کہ کم سے کم لوگ اپنی جاہلیت کی وجہ سے کرپشن میں پکڑے جائیں۔صائمہ کہتی ہے کہ جس قوم کے قانون ساز اداروں کے ممبران،اعلیٰ اشرافیہ،سیاستدان،مذہبی رہنما اور معیشت دان کرپٹ اور بددیانت ہوں اس قوم کا بحثیت قوم زندہ رہنا ایک معجزہ ہے۔صائمہ بھی چونکہ پڑھی لکھی ہے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کی طالبہ اور امیر گھرانے کی روشن خیال خاتون ہونے کے ناطے اسپر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اشرافیہ کی لاج رکھتے ہوئے تھوڑی بہت گڑھ بڑھ کرے۔صائمہ نے اس گڑھ بڑھ کی ابتداء دھوکہ دہی اور بے وفائی سے شروع کی اور یہ سب شمع،شبنم،سیما،رانی اور نرگس کی مشاورت کے بغیر کیا چونکہ صائمہ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے میں ان خواتین کے بعد آنا شروع ہوئی اور کسی وجہ سے ان سب کے آنے اور پروفیسر کے برآمدے سے جانے کے اوقات میں مطابقت نہ ہو سکی۔اگر صائمہ کی ملاقات شبنم،شمع،یا پھر رمنا اور اس کی بیسٹ فرینڈ سارہ خان سے پروفیسر کے برآمدے کی سیڑیوں پر ہو جاتی تو مجھے پورا یقین ہے کہ صائمہ کو نہ غم ہوتا نہ دکھ چونکہ وہ اپنی عملی زندگی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے بجائے بدی کی کسی بڑی صنف سے شروع کرتی اور اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت ہی نہ ملتا۔وہ اب تک شبنم،رمنا،اور سارہ کی فیلڈ میں آ چکی ہوتی جہاں پچھتاوا نام کی چیز نہیں ہوتی۔

صائمہ نے دھوکے اور بے وفائی کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ آدمی کا انتخاب کیا اور پیار کی پینگ کو جوانی کا ہلارہ دیکر پیپل کی چوٹی پر اپنے پاؤں کے تلووں کو سنہرے رنگ کے کومل پتوں سے مس کیا تا کہ کھلتی جوانی کی گرمی سے پیپل چوٹی سے جڑ تک جھلس جائے مگر اس کے پاؤں میں گاؤں کی الڑ مٹیار کے جوبن والی حرارت نہ تھی جن کے سادہ معصوم اور پاکیزہ حسن کے لمس سے پیپل کی پتیاں جھلس جاتیں اور سبز کھیتوں میں سانس کی گرمی اور حیاؑ کی ہوا سے سرسوں کے پیلے پھول کھل اٹھتے۔صائمہ جوان تو ہو گئی تھی مگر سادگی،معصومیت اور حیاؑ کی گرمی اس کے جسم سے بوجہ ضائع ہو چکی تھی جسکا احساس اسے چھ سال بعد ہوا جب وہ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے میں بیٹھی پیپل کی پیلی پتیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔صائمہ نے پیار کی پینگ کو جوانی کا ہلارہ تو دیا مگر نیچے کھڑے محبوب کے بجائے سامنے والی عمارت کی چھت پر بیٹھے نو دولتیے کے دو بیٹوں پر اپنی نظریں گاڑ دیں جو صرف اسے دیکھنے کیلئے چھت پر بیٹھے اپنی ناپاک نظروں اور حوص بھری بدبودار سانسوں سے پیپل کی پاکیزہ پیلی پتیوں کو ناپاک کر رہے تھے۔نام تو ان کے کلیم اور سلیم تھے مگر کام ناموں سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔یہ نام انہیں باپ کی طرف سے دیئے گئے تھے جبکہ ان کی ماں انھیں پیو اور گڈو کہتی تھی اور سوسائٹی میں بھی وہ اسی نام سے جانے جاتے تھے۔ان کے سارے عملی اقدامات گڈو اور پیو والے تھے چونکہ سلیم اور کلیم سے کبھی ان کا واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔صائمہ کا محبوب افروز بیگ پیپل کے پیڑ سے ٹیک لگائے دیر تک پیپل کی چوٹی پر لہراتے پیلے پتوں کو دیکھتا رہا مگر صائمہ کے جسم کی گرم ہوا سے پیپل کے پتوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ صائمہ کو پینگ پر چھوڑ کر واپس ہاسٹل آ گیا اور کئی دن تک سوچتا رہا کہ یہ کیسی جوانی ہے جس میں گرمی ہی نہیں۔۔۔کیوں ہنی۔۔۔جوانی میں گرمی کا ہونا ضروری ہے کیا؟۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہاں بالکل ضروری ہے۔۔۔ہنی بولی۔۔۔جس جوانی میں گرمی نہ ہو وہ جوانی نہیں ہوتی اور گرمی کے بغیر جوان جسم میں پیار کرنے والی روح بھی نہیں رہتی۔ایسا جوان جسم جس میں گرمی اور پیار کرنے والی

روح نہ ہو وہ محض جوان جسم کا مجسمہ ہوتا ہے جسے برقی قوت سے زندگی دیکر پپو اور گڈو قسم کے نوجوانوں کا دل بہلایا جاتا ہے۔ پپو اور گڈو کی ماں جمیل خان کی دوسری بیوی ہے۔ جمیل کی پہلی بیوی گاؤں کی تھی جسے وہ بچوں سمیت گاؤں ہی چھوڑ آیا اور آج تک واپس نہیں گیا۔ جمیل خان جمہوریت کے پہلے دور میں کسی ایم این اے کا ڈرائیور تھا۔ پھر دوسرے دور تک ترقی کرتے کرتے سنیٹر ہو گیا۔ جمہوریت کے پہلے اور دوسرے دور کے درمیانی عرصہ میں اس نے ایم این اے کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل کیا اور صرف اپنی سنیٹر شپ کی سیٹ خریدنے کیلئے پانچ کروڑ علیحدہ کر دیے جبکہ پشاور، لاہور، کراچی، اور اسلام آباد میں وسیع وعریض بنگلوں اور گاڑیوں کی خریداری پر کئی کروڑ اضافی خرچ ہوئے۔ جمیل خان نے سپر کلاس میں قدم رکھا تو ایک بڑی گاڑی اور درجن بھر باڈی گارڈوں سمیت گاؤں کا طوفانی دورہ کیا۔ مگر یہ سب خریدنے کے لئے راتوں رات پیسہ کہاں سے آیا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ہمارے ہاں پیسہ دن کو نہیں راتوں کو ہی آتا ہے ہنی نے کہا۔۔۔ آزاد کشمیر کے سیاستدان اکثر راتوں کو سفر کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے راتوں ہی کو جنگل کٹواتے اور پاکستان کی ٹمبر مارکیٹوں میں بیچتے رہے ہیں۔ راتوں راتی کے اسی تجربے نے بہت سے لکڑ چوروں، ٹیکسی ڈرائیوروں اور کمیشن خوروں کو راتوں رات ارب پتی بنا دیا۔ اب تو آزاد کشمیر احتساب بیورو بھی ان سے اضافی مراعات لیتا ہے اور احتساب بیورو کے چیئرمین سے لیکر چپڑاسی تک اندھیری رات کے سوداگروں کا تنخواہ دار ہے۔ یہی حال دوسرے محکموں کا ہے مگر مشرف صاحب چپ ہیں چونکہ یہ سب انہیں سوٹ کرتا ہے۔ اس میں مشرف صاحب کا قصور نہیں چونکہ یہ سب پاکستان کی کشمیر پالیسی کا حصہ ہے اور پالیسیاں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی ہے۔۔۔ تم جمیل کی بات کر رہی تھی۔۔۔ میں نے ہنی سے پوچھا۔۔۔ جمیل خان اور اس کا ایک جیالہ دوست جسکا تعلق آزاد حکومت سے تھا، نمونے کے طور کچھ فٹ بال یورپ اور امریکہ لے گئے اور واپسی پر دونوں ہی ارب پتی تھے۔ وہ جس ائیر پورٹ سے باہر نکلتے فٹ بال لینے والے آتے اور ان کے پہلے سے کھلے اکاؤنٹوں میں ڈالر اور پاؤنڈ ڈال دیتے۔ جمہوریت کے پہلے دور میں کافی عرصہ تک فٹ بال اور بریف کیس چلتے رہے۔ پھر کریڈٹ کارڈوں کا کاروبار شروع ہوا اور ساتھ ساتھ آزاد کشمیر اور پاکستان کے لیڈروں اور وزیروں کے ہمراہ درجنوں لوگ بیرونی دوروں پر جانے لگے۔ پہلے زمانوں میں اس کاروبار کو بردہ فروشی کہتے تھے اور آجکل اسے انسانی سمگلنگ کہا جاتا ہے۔ جمیل خان کے بھی ایسے ہی کاروبار تھے۔۔۔ ہاں میں بتا رہی تھی کہ جمیل خان گاڑیوں کے جلوس میں گاؤں گیا تو اسے امید تھی کہ سارا گاؤں اس کے استقبال کے لئے آئے گا۔ ساری برادری اس کے سامنے بچھ جائے گی اور اسے آزاد کشمیر کے نو دولتیے لیڈروں کی طرح اپنا قائد اور لیڈر مان لے گی۔ مگر جمیل خان کے گاؤں والوں نے اپنی غربت اور غیرت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ جب جمیل خان کا قافلہ کلاشنکوفوں کے برسٹ مارتا گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں کی کچی مسجد میں مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ بوڑھے میاں جی کی کانپتی آواز میں عجیب سوز تھا۔ اللہ اکبر کی صدا قریبی پہاڑوں سے ٹکرا کر ساری وادی میں گونج رہی تھی۔ ہر دل پر اللہ اکبر کے الفاظ ضرب لگا رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ مغرب سے پہلے ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ مرد مسجد کی طرف جاتے ہیں اور عورتیں لالٹینیں جلا کر کچے گھروں میں مدہم روشنی کر کے بستر بچھاتی ہیں تاکہ بچے جلدی سو جائیں۔ مرد مغرب کے بعد مسجد ہی میں بیٹھے رہتے ہیں اور دن بھر کے معاملات میاں صاحب کو بتا کر ان کے لائحہ عمل کے مطابق فیصلے کر لیتے ہیں۔ گاؤں میں عشاء کی نماز جلدی ہو جاتی ہے اور پھر لوگ بستروں پر دراز صبح کی آذان تک آرام کرتے ہیں۔ جمیل خان کی آمد پر گاؤں میں ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا چونکہ کچی سڑک پر ایکدم ٹریفک کا اتنا اودھم کبھی نہ پڑا تھا۔ جمیل خان گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے پردہ کر لیا چونکہ اس کے خاوند کے ہمراہ اجنبی بھی تھے۔ یہی کام اس کی بیٹی نے کیا جبکہ دونوں بیٹے مسجد جا چکے تھے۔ وہ کچھ دیر گھر پر رہا مگر کوئی ملنے نہ آیا تو عشاء سے پہلے ہی واپس لوٹ آیا۔

جمیل خان جب امیر ہو رہا تھا تو اس کی بیوی، بیٹی اور دونوں بیٹوں نے میاں صاحب سے پوچھا تھا کہ وہ جمیل خان کے پاس جا سکتے ہیں یا نہیں۔ میاں صاحب نے کہا جاؤ ضرور مگر اس کے ہاں رزق حلال نہیں۔ پھر فرمایا رزق حلال سلامتی ایمان کے لئے ضروری ہے۔ میاں صاحب نے مسجد کے صحن میں بیٹھے بیٹھے جمیل خان کے خاندان کو رزق حلال کے متعلق بتایا تو سب نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں ہی میں رہینگے اور رزق حلال کما کر کھائینگے۔ جمیل خان سیاست میں آیا تو انجینئر امیر مقام کی طرح بجلی کے کھمبوں، آٹے کی بوریوں، چینی کے تھیلوں اور کپڑوں کے تھانوں کے بہت سے چھکڑے لاد کر علاقے کا دورا کیا مگر کسی نے اس کا سامان نہ لیا چونکہ یہ سامان سیلاب زدگان کیلئے آیا تھا جسے پنجاب میں تقسیم ہونا تھا۔ وہ جہاں جاتا لوگ کہتے دیکھ جمیل خان یہ سامان سیلاب زدگان کا ہے۔ یہاں اللہ کا کرم ہے ہم سب سکھی ہیں۔ ہم یہ سب کیوں لیں۔ لیہ، بھکر اور راجن پور میں اس سامان کی ضرورت ہے۔ تم گوہر ایوب والا کام نہ کرو اور سیلاب زدگان کیلئے دیئے گئے گھی کے ڈبے تقسیم نہ کرو۔ ہم کھمبے لے کر کیا کرینگے۔ یہ کھمبے وہاں لے جاؤ جہاں سے بجلی کی تار چلتی ہے کھمبے وہاں سے لگانا شروع کرو اور آخری ایک اکیلا کھمبا یہاں لے آؤ جس پر تار لگی ہو۔ جمیل خان نے پوری کوشش کی مگر لوگوں نے غیرت، شرافت اور غربت کو بھونڈی سیاست اور نو دولتیے سیاستدان کی خواہشات پر قربان نہ کیا۔ ہنی اگر ایسا ہے تو پھر علاقہ ترقی کیسے کرے گا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ علاقہ ترقی کر رہا ہے۔۔۔ میاں صاحب نے سارے علاقے کی مسجدوں کو صبح سے دوپہر تک لڑکوں کے سکولوں میں اور ظہر کی نماز کے بعد سے عصر کی نماز تک لڑکیوں کے سکولوں میں بدل دیا ہے۔ علاقے کی ہر مسجد میں ڈبل شفٹ میں سکول چلتے ہیں جہاں ایک دینی جماعت استاد مہیا کرتی ہے جو انتہائی دیانتداری سے بچوں اور بچیوں کو تعلیم کی دولت سے مالا مال کر رہے ہیں۔ اس علاقے کے کئی لڑکے اور لڑکیاں اب خود پڑھانے لگے ہیں اور بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طالب علموں کے

اخراجات کا بھی معقول بندوبست ہے۔علاقہ کے مخیّر حضرات کے علاوہ ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق میاں صاحب کے پاس بچوں کے فنڈ میں کچھ نہ کچھ جمع کرواتا رہتا ہے جو مہینے کے آخر میں خاصی رقم بن جاتی ہے۔ ہر شخص محنت مزدوری کرتا ہے مویشی پالتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ جب انسان عزم اور ارادہ کر لے تو اللہ اسے اجر بھی دیتا ہے۔ یہاں کی غریبی شہر والی غریبی نہیں بلکہ نبی پاک ﷺ کے مدینے والی عالی شان غریبی ہے جس میں محتاجی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں۔۔۔وہ کیا؟۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔یہاں کے لوگ بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔۔۔وجہ کیا ہے۔میں نے پھر پوچھا۔سخت محنت کے بعد آرام، ذہنی سکون، عبادات لالچ اور بغض سے پرہیز، اخوت و بھائی چارہ۔۔۔جس ماحول میں یہ سب میسر ہو وہاں بیماریاں نہیں ہوتیں۔۔۔ہنی نے کہا۔۔ہنی ایسا ماحول باقی علاقوں، شہروں، اور قصبوں میں پیدا نہیں ہوسکتا۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ہوسکتا ہے اگر وہاں کے لوگ میاں عبدالرشید جیسے دیندار شخص کو اپنا قائد اور لیڈر مان کر اس کی ہدایات پر سچے دل سے عمل کریں۔اگر لوگ دوغلے پن اور منافقت کی سیاست کو یکسر مسترد کردیں۔اگر لوگوں میں غیرت ایمانی اور مٹی سے سچی محبت کا جذبہ بیدار ہوجائے۔اگر لوگ جمیل خان اور اس کے ساتھی آزاد کشمیری سیاستدانوں، حکمرانوں اور قوم کے غداروں کا گریبان پکڑ کر ان سے پوچھنے کی جرأت کرلیں اور اپنے خون پسینے کی کمائی ان سیاسی غنڈوں کی تجوریوں سے نکالنے کا عزم کرلیں۔اگر جج، جرنیل اور صحافی نودولتیوں کی دعوتوں پر یورپ اور امریکہ کی سیر کرنا چھوڑ دیں۔ اگر دانشور، تجزیہ نگار، شاعر اور ادیب سیمیناروں، ورکشاپوں، مشاعروں، مکالموں، مسالموں اور کانفرنسوں کی آڑ میں سمگلروں، نودولتیوں، قومی لٹیروں اور اخلاقی مجرموں کی دعوتوں پر بیرونی دورے ترک کردیں۔اگر قوم وزیر اعظم ہاؤس اور ایوان صدر کے سامنے دھرنہ دینے کی جرأت کرلے اور دونوں سے پوچھے کہ دوا رب کے دورے، بلٹ پروف گاڑیاں اور لمبے کھابے آپ نے کس کی اجازت سے کھائے۔اگر آپ لوگوں کو اپنی ہی قوم پسند نہیں کرتی تو آپ ان پر زبردستی کیوں مسلط ہیں۔جب قوم غنڈوں، سمگلروں، وڈیروں، گدی نشین سیاسی پیروں، نودولتیوں، لٹیروں، بدکردار اور بدعنوان لیڈروں کو اپنے حلقوں سے ڈنڈے مار کر بھگا دیں اور ان کے بیلٹ بکس الٹ دیں۔جب عدلیہ نظریہ ضرورت کو مسترد کر کے نظریہ جمہوریت کے حق میں فیصلہ دے اور الیکشن کمیشن اور احتساب بیورو کسی کرپٹ کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہ دیں۔جب پولیس اور پریس پر اخلاقی ضابطے کا اطلاق ہو اور صحافی سیاستدانوں کے تنخواہ دار ملازم بننے سے انکار کردیں۔جب عام آدمی کی شکایت پر سپریم جوڈیشنل کونسل کا اجلاس طلب ہو اور پہلا کرپٹ جج جیل جائے تو سارا ملک میاں عبدالرشید کا علاقہ بن جائے گا۔۔۔مگر ہنی اس میں تو بہت وقت لگے گا اور اس طرح ملک کے اندر اور باہر بیٹھی ساری کی ساری قیادت نااہل ہوجائے گی۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔زیادہ وقت نہیں لگے گا بس سال کھنڈ میں صفائی ہوجائے گی اور ملک ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ اور قوم مضبوط اور دلیر ہوجائے گی۔اگر سپریم کورٹ نے جنرل مشرف کو تین سال دیئے تھے اور بعد میں آئین میں تبدیلی کا اختیار بھی دے دیا ہے تو یہی سپریم کورٹ آئین میں ایک اور ترمیم کرے اور صدارتی جمہوری نظام کا حکم صادر فرما کر سینٹ کو ختم کردے چونکہ سینٹ بحیثیت ادارہ اپنی افادیت کھو چکا ہے اور رشوت خوروں کا محلّہ بن گیا ہے۔سینٹ کے حالیہ انتخابات میں کروڑوں کی ڈیل نے اس ادارے کا تقدس تباہ کردیا ہے۔ایسا ادارہ جو اپنی اخلاقی قدر کھو دے اور اس کی موجودگی سے عوامی مفاد کا بھی تعلق نہ ہو اسے عوام کے خرچے پر چلانا اور سینیٹروں کو عیش موج کروانا کسی طور جائز اور درست نہیں۔دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں ایوان بالا کے بغیر ہی نظام چل رہے ہیں۔سپریم کورٹ ملک میں دو سال کیلئے عبوری حکومت قائم کرے اور احتسات بیورو اور الیکشن کمیشن کو حکم دے کہ عدلیہ اور انتظامیہ سے لیکر نیچے کی سطح تک ہر شخص کا احتساب کریں اور کسی بھی شخص کو معاف نہ کیا جائے۔ ہر جنرل، جج، صحافی، وکیل، کارخانہ دار، جاگیردار، سرمایہ دار، سیاستدان اور سرکاری ملازم سے اس کی دولت کا حساب لیا جائے کہ کس نے کسطرح اور کہاں سے مال کمایا ہے۔ ہر شخص کو اس کی جائز اور محنت کی کمائی کا حق دے کر لوٹا اور چھینا ہوا مال قومی خزانے میں ڈالا جائے اور چوروں کو سزا دیکر آئندہ کیلئے انھیں صاف ستھری زندگیاں جینے کا حق بھی دیا جائے۔صائمہ نے اپنے سیاسی خاکے میں ایک خیالی عبوری حکومت اور کابینہ بھی تشکیل دے رکھی ہے۔صائمہ مرکز سے آدھی وزارتیں ختم کر کے انہیں ڈائیریکٹوریٹس میں بدل کر دوسری وزارتوں میں ضم کرنے یا پھر صوبوں کے حوالے کرنے کے حق میں ہے۔صائمہ کہتی ہے کہ جب تک پولیس کا محکمہ لوکلائیز نہیں ہوتا ملک میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔لوکلائیز سے صائمہ کی کیا مراد ہے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔ ہر ضلعے کا ایک پولیس چیف ہو جسکا تعلق اسی ضلعے سے ہونا چاہئے۔ پولیس کے باقی افسران اور جوان بھی اسی ضلعے سے لئے جائیں۔ پولیس کا سربراہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے ماتحت ہو اور صوبے کی پولیس کا سربراہ صوبے کا گورنر ہو۔ پولیس کے جوانوں کی تربیت کیلئے صوبے میں ایک تربیت گاہ ہو جبکہ پولیس افیسروں کی ابتدائی تربیت پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں اور خصوصی تربیت پولیس اکیڈیمی میں ہو۔نیشنل پولیس فاؤنڈیشن اور دیگر فضول ادارے ختم کر کے قومی خزانے کا بوجھ ہلکا کرنا چاہئے۔۔۔ہنی یہ بتاؤ کہ عبوری حکومت کے بعد وزیر مشیر کون ہونگے۔۔۔میں نے پوچھا۔۔۔جو احتساب بیورو اور الیکشن کمیشن کی چھاننی میں بچ جائینگے اور میں دعوے سے کہتی ہوں بہت سے بچ جائینگے چونکہ ملک میں اچھے اور کام کرنے والے افراد کی کمی نہیں۔اچھے آدمیوں میں مشرف صاحب بھی شامل ہیں بشرطیکہ چوہدریوں کی چھتری سے باہر بیٹھ کر خود اعتمادی سے کام کریں اور لیگی دانشوروں پر بھروسہ چھوڑ دیں۔مشاہد صاحب اور ان کی دانشور ٹیم پہلے دو پارٹیوں کو دبئی اور جدہ پہنچا چکی ہے۔صائمہ کہتی ہے کہ ہر اسمبلی ممبر کی تنخواہ دس ہزار ماہانہ ہو جو کہ عام آدمی کی تنخواہ ہے۔وزیروں کی سولہویں گریڈ کے برابر اور صدر اور گورنروں کی سترویں گریڈ کے برابر تاکہ انہیں بجٹ بناتے وقت آسانی ہو اور انہیں یہ بھی پتہ ہو کہ ملک کی اٹھارہ بیس کروڑ آبادی کے کیا مسائل ہیں اور عام آدمی کی زندگی کیسی ہے۔اسمبلی ممبروں، وزیروں اور سرکاری

افسروں کوصرف ریلوے کے ٹکٹ دیئے جائیں۔ ہاں اگر کوئی اپنی جیب سے خرچ کر کے جہاز کی سواری کرنا چاہے تو اسے اجازت ہو۔ صائمہ کے منصوبے میں اوپر کی سطح پر سادگی اور کفایت شعاری لاگوں کرنے کی ضرورت ہے۔ صائمہ کے مطابق تاجروں اور صنعت کاروں پر سیاست کاری کی پابندی ہونی چاہئے تاکہ وہ ملکی معیشت کو مضبوط کرنے اور عوامی خوشحالی کے لئے کام کریں۔ اس طبقے نے پاکستانی سیاست میں دخل دیکر لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہے اور کرپشن کی سیاست کو فروغ دیا ہے۔ چینی سکینڈل سمیت دیگر ساری قباعتیں ان ہی لوگوں کی پیدا کردہ ہیں جنکا احتساب ضروری ہے۔۔۔ میں تمہیں جمیل خان کے متعلق بتا رہی تھی۔۔۔ ہنی بیگم نے کہا۔۔۔ ایک جمیل خان کیا اب تو نوے فیصد سیاستدان جمیل خان کے شاگرد ہیں اور لوٹ مار میں جمیل خان کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ جمیل خان کی بیوی اور بچوں نے اس کی حرام کی کمائی اور شان وشوکت سے لاتعلقی اختیار کی تو وہ اپنے عالیشان مکانوں میں وزیروں، مشیروں، بڑے بڑے کاروباری لوگوں اور اعلیٰ افسروں کی دعوتیں کرنے لگا۔ مانسہرے کا ایک سیّد اور ایبٹ آباد کا ایک گجر اسکے صلاح کار بن گئے اور اسے چانکیا نیتی کی نئی نئی چالیں سکھانے لگے۔ اسی طرح کی ایک محفل میں کسی اعلیٰ افسر کی جان پہچان والی نرگس جان اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ جمیل خان کی پارٹی میں شریک ہوئی جسے شاہ صاحب اور چوہدری صاحب نے پھانس پھونس کر جمیل خان کے اتنا قریب کر دیا کہ نو دولتیہ سیاستدان بوائے کٹ والی بڈی کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ نرگس جان معمولی پڑھی لکھی مگر شاطر عورت تھی اور حال ہی میں امریکہ سے اپنے خاوند کو طلاق دیکر وطن عزیز لوٹی تھی۔ طلاق کے بعد نرگس جان نے واپسی کا ارادہ کیا تو خاوند نے بچے بھی ساتھ کر دیے چونکہ اسے شک تھا کہ بچے کسی اور کے پیار کی نشانی ہیں۔ نرگس نے جمیل سے شادی کر کے بچے بھی اس کی گود میں ڈال دیے اور جمیل خان کی سیاسی کمائی میں بچوں کو حصے دار بنوا دیا۔

جمیل خان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں نرگس اور اس کے بچوں نے اہم رول ادا کیا اور اسے سپر کلاس میں ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ نرگس اور بچے فر فر انگریزی بولتے تھے۔ نرگس ہر رنگ کا لباس پہننے اور اسپر گھنٹوں گفتگو کرنے کی پہلے سے ماہر تھی۔ اسے پتہ تھا کہ کس موقع پر کونسا لباس پہننا ہے اور کس موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ وہ سپر کلاس خواتین کے کلب کی ممبر بن گئی اور بچوں کو بیکن ہاؤس میں ڈال دیا۔ نرگس کے بغیر سپر کلاس کا کوئی شو اور میٹنگ مکمل نہ ہوتی۔ وہ ہر موقع پر احتیاط سے کام لیتی۔ جہاں ضرورت ہوتی وہ گلے ملتی جہاں ہاتھ ملانا اور بوسہ دینا یا لینا ہوتا وہ یہ کام بھی سلیقے سے کر ڈالتی۔ مسز خان سپر کلاس میں جمیل خان کی پہچان بن گئی اور اس کے صلے میں جمیل خان نے نرگس کے بچوں کو اپنا نام بھی دیا اور کام بھی سکھلا دیے تاکہ وہ مستقبل کے سیاسی لیڈر بن کر ملک اور قوم کا نام روشن کر سکیں۔

صائمہ پینگ سے اتری تو پپو اور گڈو کافی ٹیبل پر اس کے منتظر تھے۔ صائمہ کی آمد پر نرگس بھی پارٹی میں شامل ہو گئی اور صائمہ کو اپنے بچپن، جوانی، شادی، سیاست اور سوشل لائف کے متعلق بتانے لگی۔ نرگس نے صائمہ کو بتایا کہ اس کا باپ ایک بڑا بزنس مین تھا۔ وہ پیرس میں پیدا ہوئی اور ہاورڈ سے گریجوایشن کی۔ اس نے بتایا کہ وہ بچپن ہی سے جمیل خان کو چاہتی تھی اور اس سے پیار کرتی تھی۔۔۔ مگر ہنی تم تو کہہ رہی تھی کہ نرگس لالہ موسیٰ کی ہے۔۔۔ ہاں ایسے ہی ہے۔۔۔ مگر ہر نو دولتیے اور سلف میڈ آدمی کا یہی پرابلم ہوتا ہے کہ وہ خود غرض اور بعض اوقات ظالم اور سفاک ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حال سے ماضی کو خارج کرتا رہتا ہے اور ماضی میں جن کے ساتھ وہ رہ کر حال تک پہنچتا ہے ان سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ان سے دور بھاگتا ہے اور انہیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے۔ نو دولتیوں اور سلف میڈ لوگوں کی عجیب نفسیات ہوتی ہے۔ اگر وہ خوف خدا میں مبتلا ہوں تو ان کا ماضی انہیں اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے۔ وہ سخی اور غریب پرور بن جاتے ہیں اور خلق خدا کی دعائیں لینے میں ہی اپنی آفیت سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ماضی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں مگر ماضی ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہتا ہے۔ ایسے لوگ خودنمائی کا شکار ہوتے ہیں اور ہمیشہ جھوٹے قصے کہانیاں سنا کر اپنے آپ کو امیر کبیر خاندانوں اور گھرانوں کا فرد ظاہر کرتے ہیں۔ اگر تم آزاد کشمیر کی حالیہ سیاسی قیادت کا تجزیہ کرو تو سبھی لیڈر صاحبان نو دولتیے اور سلف میڈ ہیں مگر بہت کم ایسے ہیں جنہیں سردار محمد ابراہیم خان کے مدمقابل کھڑا کیا جا سکے۔ سردار محمد ابراہیم خان مرحوم بھی سلف میڈ تھے مگر انہیں اپنی اس خوبی پر فخر تھا۔ وہ کئی بار آزاد کشمیر کے صدر بنے مگر خودداری اور قوم کی عزت وعظمت کو ہمیشہ محترم اور مقدس سمجھا۔ وہ کسی کرپشن میں ملوث نہ ہوئے اور نہ ہی ان کی اولاد میں سے کسی نے باپ کی سفید پوشی کو داغدار کیا۔ یہی حال مرحوم کے ایچ خورشید اور چوہدری غلام عباس کا تھا۔ ان کا تعلق موجودہ آزاد کشمیر سے تو نہ تھا مگر بحیثیت کشمیری اور سلف میڈ شخصیات کے ان کا قد بھی بہت اونچا تھا۔ آج آزاد کشمیر کی سیاست اور لوٹ مار پروگرام کے قائدین بھی سلف میڈ اور نو دولتیے ہیں۔ آزاد کشمیر کی خودفہم اور نااہل قیادت سرتاپا کرپٹ اور بدکردار تو ہے ہی مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام اور پاکستانی اشرافیہ میں یہ لوگ بے حد مقبول ہیں۔ غیر جانبدار تجزیہ کاروں کے مطابق کرپٹ قیادت کی حمایت آزاد کشمیر کے عوام کی غلامانہ ذہنیت کی عکاس ہے۔ جب قوم میں چوروں اور لٹیروں کو اپنا قائد اور لیڈر مان لیں تو عزت وآزادی ان کا مقدر نہیں رہتی۔ پاکستانی اشرافیہ چونکہ اس لوٹ مار سے حصہ لیتی ہے اور اپنے نمائندوں کے ذریعے آزاد کشمیر پر حکمرانی کرتی ہے اس لئے وہ نہ صرف ان قائدین کی حمایت کرتی ہے بلکہ بہت سے عدالتی اور انتظامی امور پر بھی ان کی مرضی مسلط کی جاتی ہے۔

آپ آزاد کشمیر کے کسی بھی سیاستدان یا حکمران سے ملیں آپ اُسے احساس کمتری اور خودنمائی کی بیماری میں مبتلا پائینگے۔ ہر ایک کا باپ یا دادا تحریک آزادی کا ہیرو اور پردادا اپنے قبیلے کا سردار اور مہاراجہ کشمیر سے برسرپیکار ہراول دستے کا مہرہ رہ چکا ہے۔ آزاد کشمیر ایک چھوٹا خطہ ہے اور قبائلی رسم ورواج کے حامل اس پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقہ کی ایک منفرد تاریخ ہے۔ آپ بھمبھر سے گریس تک سفر کریں تو کوئی بھی شخص آپ کو تاریخ سے نابلد نظر نہیں آئے گا۔ سب کو پتہ ہے کہ ان کے لیڈروں کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے مگر بے

حسی کا عالم یہ ہے کہ کوئی شخص اس نام نہاد قیادت کی مخالفت مول نہیں لے سکتا۔ اس محرومی اور محکومی کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ اس کی ذمہ دار حکومت پاکستان اور پاکستانی سول اور ملٹری قیادت ہے چونکہ ہر کرپٹ اور بدکردار لیڈر کے پیچھے پاکستانی سیاست اور اسٹیبلشمنٹ کا کوئی نہ کوئی ویوہیکل بت کھڑا ہے۔ اسلام آباد میں ان کرپٹ قائدین کی عالیشان کوٹھیاں پاکستانی اعلیٰ اشرافیہ کی عیش گاہیں ہیں جہاں دنیا کی ہر شیطانی نعمت انہیں مفت مہیا کی جاتی ہے۔ آزاد کشمیر کی اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان اور دیگر اہم محکموں کے سربراہان کا تقرر وزیراعظم پاکستان یا چیف ایگزیکٹو آف پاکستان کرتے ہیں اور یہ تقرریاں میرٹ اور اعلیٰ معیار پر بہت کم ہوتی ہیں۔ ان تقرریوں کے سلسلہ میں ذاتی پسند و ناپسند اور مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بعض واقعات ایسے بھی ہیں کہ بعض لیڈروں اور برادریوں نے کروڑوں روپے رشوت دیکر اعلیٰ عہدے، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے خریدے تا کہ وہ اپنے بندوں کی قوت سے اپنے مخالفین کی بیخ کنی کر سکیں۔ ظاہر ہے جب ایسے لوگ زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کا لائسنس لیکر آزاد کشمیر کے عوام پر مسلط کر دیے جاتے ہیں تو عوام کی غیرت اور عزت نفس اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ اگر عوام کی غیرت ایمانی اور عزت نفس پر مسلسل چرکے لگائے جائیں تو ان میں برائی اور بدکرداری کے بتوں کو توڑنے کا حوصلہ اور ہمت باقی نہیں رہتی۔

نرگس خان آزاد کشمیر کی قیادت کا ایک نمونہ ہے اور اسی قبیلے اور کلب کی ممبر بھی ہے جو اپنی زندگیاں خودنمائی اور خودغرضی کی کشتی میں بیٹھ کر گزارتے ہیں تا کہ وہ آباد جزیروں میں مقیم غریبوں، سفید پوشوں اور ضرورت مندوں کی پرچھائیوں سے محفوظ رہیں۔ ان کشتیوں میں بیٹھ کر یہ لوگ لوٹ مار کرتے ہیں اور لوٹا ہوا مال بڑے جہازوں اور بجروں پر منتقل کرتے ہیں تا کہ ان کی طرح ان کا خزانہ بھی عوام کی نظروں سے اوجھل رہے مگر کبھی کبھی تقدیر کا تھپیڑا انہیں ان کے مال و عیال سمیت تہہ آب کر دیتا ہے۔ نرگس کا باپ لالہ موسیٰ کا اور ماں شنکیاری کی رہنے والی تھی۔ نرگس کے پرانے محلے والوں کا کہنا ہے کہ نرگس کے نانا نے بھلے وقتوں میں غربت سے تنگ آ کر نرگس کی ماں کو نرگس کے باپ کے ہاتھوں ڈھائی سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ نرگس کا والد بعد میں پنڈی شفٹ ہو گیا جہاں نرگس نے ٹینچ بھاٹا کے ایک سکول سے میٹرک پاس کیا اور پنڈی ہی میں ٹیلیفون آپریٹر بھرتی ہو گئی۔ اس آپریٹری کے دوران اس نے ایک امریکہ پلٹ شادی شدہ آدمی کو پھنسایا اور اس سے شادی کر کے ان کے گاؤں ہری چند آ گئی۔ کریم خان نے امریکہ سے خوب ڈالر کما رکھے تھے اور صرافہ بازار میں اپنے ایک افغان دوست کے ذریعے سود کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ سود سے حاصل شدہ رقم سے اس نے کراچی، پشاور، اسلام آباد اور لاہور میں بنگلے تعمیر کئے مگر نرگس سے شادی کے بعد اس کا سارا سودی کاروبار الٹ گیا۔ کریم خان کے چار بنگلوں میں سے دو پر ٹیلیفون آپریٹر نرگس نے قبضہ کر لیا اور وہاں اپنی ماں اور تین بہنوں کو آباد کر دیا جبکہ باقی دو پر کریم کی پہلی بیوی گل رعنا اور اس کے سات بیٹے قابض ہو گئے۔ کریم خان بیٹوں اور بیوی کے ڈر سے واپس امریکہ بھاگ گیا اور کچھ عرصہ بعد اسے پتہ چلا کہ نرگس جان نے دو جڑواں بچوں کلیم خان اور سلیم خان کو جنم دیا ہے۔ کریم خان سے پہلے نرگس کے بہت سے دوست تھے اور کوٹھی میں منتقل ہونے کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو گل رعنا اور اس کے بیٹوں نے نرگس کے متعلق بہت سی باتیں مشہور کیئیں اور کئی واقعات کے ثبوت بھی کریم خان کو بھیجے مگر وہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے عوام کی طرح ہمت ہی ہار بیٹھا تھا سو کچھ نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ بعد نرگس اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ امریکہ پہنچ گئی اور کریم خان کو مکمل کنگال کرنے کے بعد ایک اعلیٰ عہدیدار سے دوستی کر کے واپس آ گئی جہاں جمیل خان اپنا خالی جام لئے نرگس کی بھری بھرائی صراحی کا منتظر تھا۔ اعلیٰ افسر نے برائی کا طوق ہمراہ بچوں کے جمیل خان کے گلے میں ڈالا اور خود اپنا شکار الیکر گہرے پانیوں کی طرف چل دیا۔ نرگس جان ملٹی نیشنل اور ملٹی کلچرل خاتون ہے جسکا نہ آ گا ہے نہ پیچھا۔ وہ پنجن کسانہ کو پیرس اور ٹینچ بھاٹہ کو ہاورڈ کہہ سکتی ہے چونکہ جمیل خان کے بڑے بڑے اکاؤنٹ فرانس اور امریکہ کے بینکوں میں بھی ہیں جو اب نرگس جمیل اور جمیل خان کے جوئنٹ اکاؤنٹ بن چکے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ آزاد کشمیر کے ایک بڑے سیاسی لیڈر کے باپ کے پاس دو کھوتیاں تھیں جن پر بار برادری کر کے وہ اپنے بچوں کو پالتا تھا۔ بعد میں لیڈر کسی کا بیٹا بن کر امریکہ گیا اور واپس آ کر لیڈر بن گیا۔ نرگس جان کا یہ روحانی بھائی جس کے پاس لندن، پیرس، دوبئی، لکسمبرگ، اور بارسلونا میں بڑے بڑے کاروبار ہیں اپنے پاکستانی قائدین اور اسٹیبلشمنٹ میں وکیل مشہور ہے۔ آزاد کشمیر میں پچھلے انتخابات کے دوران میٹرک کی شرط رکھی گئی تو موصوف کورے ان پڑھ ثابت ہوئے اور آجکل نہ صرف بی اے بلکہ ایل ایل بی بھی ہو گئے ہیں جو کہ پاکستان کے تعلیمی نظام اور معیار کی اعلیٰ مثال ہے۔ جمیل خان کی طرح ان صاحب نے بھی کباڑی بازار راولپنڈی سے کاٹھ کباڑ خریدا اور اسے انٹیک بنا کر اور اس انٹیک کی رگوں میں پوڈر بھر بھر کر یورپ اور امریکہ بھیجا اور اربوں ڈالر کما کر پاکستان اور آزاد کشمیر کے انڈر ورلڈ کا چیف ایگزیکٹو بن گیا۔ کاٹھ کباڑ کے اس بیوپاری کی اخلاقی گراوٹ اور سیاسی کرپشن سے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ بخوبی واقف ہے اور آزاد کشمیر اور پاکستان کے بڑے بڑے سیاسی قائدین اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار اس کباڑیے کے وظیفہ خوار ہیں۔ وہ عدالتیں اور تھانے خریدتا ہے اور اعلیٰ عہدیداروں کے بیرون ملک اور اندرون ملک علاج معالجے کرواتا ہے۔ ان کے بچوں کی شادیوں پر شاہانہ انتظامات کرواتا ہے اور عدالتوں سے مرضی کے فیصلے کرواتا ہے۔ اب تم خود اندازہ کر لو کہ جس ملک اور قوم کی ناؤ کا چپو نرگس جان، جمیل خان، کریم خان اور چوہدری کباڑ جیسے کھویوں کے ہاتھ ہوا سے ڈوبنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ہماری قومی ناؤ اب تقدیر کے تھپیڑے کی منتظر ہے جو کسی بھی لمحے اسے تہہ آب کر سکتا ہے۔۔۔ مگر یہی تقدیر اسے قائداعظمؒ کی طرح کوئی اچھا ملاح پھر دے سکتی ہے؟۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ اگر قوم ہمت کرے اور غیرت ایمانی اور عزت نفس کی چنگاری شعلہ بن جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مولانا فضل الرحمٰن جیسے قائدین مفادات کی بالٹی میں ہوس کا پانی ڈالے الرٹ کھڑے رہتے ہیں تا کہ چنگاری کی لو

دیکھتے ہی اس پر حرص اقتدار کا چھڑکاؤ کر کے اسے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ایک طرف قاضی صاحب ہیں کہ ٹھنڈے دودھ میں پھونکیں مار مار کر اسے اُبال دیتے ہیں اور دوسری جانب امین فہیم اور فضل الرحمٰن پانی کا چھینٹا مار کر دیگ ہی ٹھنڈی کر دیتے ہیں تا کہ شیر کباڑستان اور اس کے ہمنوا آ ولیاں، بالٹیاں اور لوٹے بھر بھر کر پیئیں اور عوام اپنے بلوں میں چوہوں کی طرح دب کر ان کا بچا کھچا کھانے کے منتظر رہیں۔

ہاں میں تمہیں نرگس جمیل خان کے متعلق بتا رہی تھی۔کافی ٹیبل پر نرگس کی باتیں سن کر صائمہ نے اسے اپنا آئیڈیل بنالیا اور افروز بیگ کو ہاسٹل کے فون پر بتایا کہ وہ آئندہ اسے کسی پیپل پر پڑی پینگ پر لے جانے کی فرمائش نہ کرے اور کچھ عرصہ کیلئے اس سے دور ہی رہے۔افروز بیگ کو پتہ چلا کہ صائمہ پپو اور گڈو کیساتھ ایم ایم عالم روڈ والی بیکری پر جانے لگی ہے اور ایف ٹن والی نرگس کی کوٹھی میں ہونے والی پارٹیوں میں بھی شریک ہوتی ہے تو افروز بیگ نے ایک تحریر لکھ کر صائمہ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خدا حافظ کہہ دیا۔صائمہ نے نرگس کے بعد کئی اور پارٹیاں بدلیں، آستانوں اور درباروں پر گئی۔سیمینار، ورکشاپیں اور مشاعرے اٹنڈ کیئے۔کارنر میٹنگوں میں شامل ہوئی، تقریریں کیں اور سنیں۔اخباروں اور رسالوں میں مضمون لکھے اور مختلف موضوعات پر بحثیں کیں مگر پیپل اور پینگ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہے۔وہ فائیو سٹار ہوٹل میں ہو یا اپنے گھر کے آرام دہ بستر پر افروز بیگ کا خط، پیپل کے پتوں کی سرسر اور پینگ کی کھر دری بنڈی اسکا ساتھ نہیں چھوڑتی۔وہ کئی بار پرانے پیپل کے پیڑ کی جگہ گئی مگر وہاں وہ پیپل اب نہیں رہا۔اب وہاں ایک عالیشان پلازہ ہے جسے پرانے پیپل کو شہید کر کے کسی نو دولتیے سیاستدان نے اپنی کرپشن کی کمائی سے تعمیر کیا ہے۔صائمہ چونکہ ریسرچ سکالر ہے اور کوئی ریسرچ حقیقت کو جانے اور مانے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔وہ جب بھی حقیقت کے حق کو تسلیم کرنے کے قریب ہوتی ہے تو اسے پیپل کی حقیقی چھاؤں، پینگ کی حقیقی اٹھان، ہلارے کی تان، بنڈی کی حقیقی استقامت اور افروز بیگ کے حقیقی پیار کو بنیاد بنا کر آگے چلنا ہوتا ہے مگر یہ سب بنیادی حقیقتیں اب قصہ ماضی ہوگئی ہیں۔اب نہ افروز ہے نہ پینگ ہے اور نہ ہی پیپل۔بس ایک خط ہے جو ان سب کی یاد دلاتا اور صائمہ کو اداس کرتا رہتا ہے۔حقیقت سے چشم پوشی اور بے حقیقت زندگی کی بدذائقہ اور بدبودار جلن سڑن اور خلش صائمہ ہی نہیں بلکہ ملک کے کروڑوں لوگوں کا المیہ ہے جو جمیل خان، چوہدری کباڑ، نرگس جان اور ان کی برادری کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کے ووٹر اور سپوٹر ہیں۔یہ لوگ سیاست کے کباڑی بازار کے کباڑیوں کو آئیڈیل بنا کر انھیں کرپشن اور لوٹ مار کا جمہوری لائسنس دلوانے میں مدد دیتے ہیں اور ان کی بداعمالیوں اور بے قائدگیوں سے بنائے ہوئے نظام کا شکار کبھی اپنے بچوں کے گلوں پر چھریاں چلاتے ہیں تو کبھی چوہے مار گولیاں کھا کر ابدی نیند سونے کی کوشش کرتے ہیں۔بہت سے صائمہ کی طرح پرانے پیپلوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور سرسر کرتے پتوں کی مدہم آواز کو یاد کر کے روتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔

پرل کانٹی نینٹل میں حقوق انسانی کے موضوع پر ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے صائمہ نے کہا کہ! اے کاش کہ ہم ایک قوم ہوتے تو ہمارا کوئی لیڈر بھی ہوتا جو ہمارے حقوق و فرائض کا تعین کرتا، ہمیں عدل وانصاف مہیا کرتا۔ہمیں انسان سمجھ کر ہم پر انسانوں والے قوانین کا نفاذ کرتا۔مگر افسوس کہ ہم ایک قوم نہیں ہیں۔صائمہ کے ان الفاظ پر حاضرین محفل چونک اٹھے اور صاحب صدر نے جو ایک دانشور ہستی تھے غصیلی نظروں سے صائمہ کی طرف دیکھا۔صائمہ نے حسرت بھری نگاہ حاضرین پر ڈالی اور پوری توجہ سے کرسی صدارت پر بیٹھی دانشور ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔صدر ذی وقار یہ میرے نہیں قائد اعظمؒ کے الفاظ ہیں۔جنرل گل حسن مرحوم نے اپنی یادوں کو قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب قیام پاکستان کے بعد قائداعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل کراچی آئے تو وہاں ایک عجیب سماں تھا۔ہمارا جہاز ماڑی پور رن وے پر اترنے کی کوشش کر رہا تھا مگر زمین پر ہر طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جو رن وے تک پہنچ چکا تھا۔لوگ ہر طرف بھاگ رہے تھے تا کہ جہاز سے نکلتے وقت قائداعظمؒ کو دیکھ سکیں۔قائد نے کئی بار گھڑی پر نظر ڈالی تو انھیں محسوس ہوا کہ جہاز کراچی کی فضاؤں میں چکر لگا کر وقت ضائع کر رہا ہے۔پوچھنے پر پائلٹ نے بتایا کہ ہجوم اسقدر ہے کہ رن وے تک خالی نہیں ہو رہا۔قائد نے مجھ سے پوچھا گل وٹ از دس۔ میں نے جواب دیا سر یور نیشن ہیز کم ٹو گریٹ یو، قائد بولے نو دس از ناٹ اے نیشن دس از اے کراوڈ وچ ہیز ٹو بی ڈسپلنڈ۔

صدر مجلس:۔افسوس صد افسوس کہ آج تک اس جم غفیر کو کوئی لیڈر نہ ملا جو اسے ایک قوم میں بدل سکتا۔کون نہیں جانتا کہ قائداعظمؒ کی پالیسوں اور حکمت عملی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کے معتمد خاص لیاقت علی خان تھے۔لوگ کہتے ہیں کہ صائمہ کی تقریر پر صرف جنرل حمید گل نے ہی داد دی جبکہ مشاہد حسین سیّد اور دوسرے دانشور خاموش اور کچھ کچھ ناراض بھی رہے۔صائمہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ قومی یکجہتی کا مظاہرہ این جی او کی لگائی ہوئی دکانوں اور چندہ مہم سے نہیں لگایا جا سکتا۔قومی جرأت و کردار کا عملی نمونہ کلر سیداں سے آنی والی وہ بس تھی جو ایک دن صبح سویرے پچاس مسافروں سمیت سہالہ کے کاک پل سے دریائے سواں میں جا گری۔اس بس کی اُکھڑی سیٹیں رسوں سے بندھی ہوئی تھیں کہ ایک آدمی نے بس میں کھڑے ہو کر کہا اُوئے ظالم نیا پُتر اذرا بھلیں چل کیاں مارن لگا ایں (او ظالم کے بچے ذرا آہستہ چل کیوں مارنے لگا ہے)۔یہ اس مسافر کا جائز احتجاج تھا مگر ڈرائیور نے گاڑی روک کر کنڈیکٹر سے کہا کہ اِسی تکاماری کے باہر کڈی سَٹ گڈی مہاڑی اے جس طرح چاہساں چلاسیاں۔(اسے دھکا دیکر باہر پھینک دو گاڑی میری ہے اپنی مرضی سے چلاؤنگا)۔کنڈیکٹر نے بوڑھے گجر کو دودھ کے ڈبوں سمیت گاڑی سے باہر پھینک دیا اور باقی سواریوں نے بھی ظالم کا ساتھ دیا اور کنڈیکٹر اور ڈرائیور سے خوشامد کر کے کہنے لگے کہ جناب جلدی پہنچو جیسے مرضی ہے چلاؤ۔حیرت کی بات یہ تھی کہ بس کی فرنٹ سیٹ پر دو پولیس والے اور ان کے پیچھے راستے کے سکولوں کے بہت سے استاد اور استانیاں

بھی بیٹھی تھیں مگر کسی میں اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وہ ان پڑھ گنوار ڈرائیور کی سرزنش کرتا۔ اسے آہستہ چلانے کا کہتا اور بوڑھے گجر کی عزت نفس اور غیرت ایمانی کا تحفظ کرتا اور خود اپنے سفر کو بھی محفوظ بناتا۔ اگر پچاس آدمی جن میں پڑھے لکھے ان پڑھ اور قانون کے محافظ بھی شامل تھے ایک ڈرائیور کی بدمعاشی پر احتجاج نہیں کر سکے تو سولہ کروڑ غلام اپنے دس ہزار آقاؤں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ پنڈی سے کلر سیداں۔ پشاور سے باڑہ، گجرات سے بھمبھر، دینہ سے روہتاس اور ڈومیلی، کوئٹہ سے چمن، لاہور سے کھڈیاں، سکھر سے شکار پور اور کشمور سے کندکوٹ جانے والی بسیں، ان کے مسافر اور ڈرائیور ہماری جمہوریت اور قومی سوچ اور کردار کے عکاس ہیں۔ اگر ایک مسافر احتجاج کرتا ہے تو پچاس ظالم ڈرائیور کا ساتھ دے کر اس کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ حاضرین محترم:۔ آج وطن عزیز کی حالت کلر سیداں، باڑہ، کھڈیاں، سکھر اور کشمور والی بسوں سے کچھ کم نہیں۔ ملک کی یہ حالت ہمارے مفاد پرست سیاست دانوں، ان کے ہمنوا دانشوروں اور نوکر شاہی نے ملکر کی ہے چونکہ انہیں پتہ ہے کہ اس ملک میں سولہ کروڑ انسانوں کا ایک جم غفیر بستا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ سولہ کروڑ انسانوں کا مجمع برادریوں، قبیلوں، زبانوں اور علاقوں کے تعصّبات میں مبتلا رہے اور وہ ان تعصّبات اور نفرتوں کی آڑ میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھیں۔ اگر کہیں یہ جم غفیر قومی قوت بن گئی تو پھر اس قوت کے سامنے کرپشن، دھوکے، فراڈ اور فساد کی سیاست ٹھہر نہ سکے گی۔ صائمہ نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ سٹیج پر بیٹھے دانشوروں کو کلر سیداں والی بس میں بیٹھی سولہ کروڑ بے بس سواریوں کی مجبوریوں اور محکومیوں کا احساس نہیں چونکہ ان میں سے کوئی کبھی اس بس میں بیٹھا ہی نہیں۔ عورتوں کے حقوق پر کل ایک سیمینار تھا جس کی مہمان خصوصی مختاراں مائی تھی۔ یہ سیمینار بھی ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھا جس کے پچھواڑے میں ایک جوان عورت دوائی نہ ملنے کی وجہ سے مرگئی تھی اور اس کا خاوند رات کے اندھیرے کا منتظر تھا کہ اسے اسلام آباد سے باہر کسی ویران جگہ دفنا دے چونکہ اسلام آباد کے وی آئی پی قبرستان میں غریبوں کا داخلہ منع ہے اور قبر کی جگہ خریدنا آسان کام نہیں۔ اس سیمینار میں پانچ پانچ بوائے فرینڈز رکھنے والی خواتین بھی بیٹھی تھیں جو عملاً ہر ہفتے مختاراں مائی کے بتائے ہوئے افسانے کو حقیقت کا روپ دیتی ہیں مگر اس پر ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کوئی ٹی وی پروگرام نہیں کرتے اور نہ ہی اے آر وائی اور جیو ٹی وی والے تھالی دانشور کسی شو کا اہتمام کرتے ہیں چونکہ یہ سب سپر کلاس کے معاملات ہیں اور ہمارے مذہبی دانشور اسے باالرضا کا نام دیکر پہلو تہی کرتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں پاکستان کا وجود خطرے میں ہے اور اسلام کو بھی خطرات لاحق ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور اسلام دونوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ سولہ کروڑ مسلمانوں کا کمزور ایمان خطرے میں ہے جس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ اگر کلر سیداں اور باڑے کے پچاس مسافر ہمت کریں تو ڈرائیوروں کا مزاج درست کردیں اور حلقے کے ایم این اے اور ایم پی اے کا علاقہ میں داخلہ بند کر کے ٹوٹی پھوٹی اور انجر پنجر بسوں کی جگہ بہتر ٹرانسپورٹ کا انتظام کروانے تک احتجاج جاری رکھیں۔ ہمارے ایک دانشور نے ابھی چین کی مثال دیکر ہال میں تالیاں بجوا کر اپنی دانشورانہ خوش فہمی میں اضافہ کیا۔ صاحب علم ہستی نے فرمایا کہ چواین لائی ایک سکول ٹیچر تھے مگر وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ ہمارے ہاں بڑے عظیم جرنیل اور سیاستدان ساٹھ سالوں سے حکمرانی کر رہے ہیں مگر وہ ایک معمولی سکول ٹیچر کی خاک پا کو بھی نہ چھو سکے اور ایک سیاستدان کا بنایا ہوا ملک کلر سیداں والی پھٹیچر بس میں بدل دیا۔ چند روز پہلے سادگی اور خود انحصاری پر ہونے والے سیمینار میں تقریر کرنے والے ایک صاحب نے چھ ہزار ڈالر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسٹیج پر بیٹھی خواتین ہیروں کے ہار پہنے بیٹھی تھیں۔ پتہ نہیں ہم کب تک خود فہمیوں کا شکار سولہ کروڑ کے بے ہنگم کراوڈ کو بیوقوف بناتے رہیں گے۔ صائمہ کی تقریر جاری تھی کہ حال میں اچانک بجلی غائب ہوگئی اور سیمینار اختتامی تقریر کے بغیر ہی ختم ہوگیا۔۔۔ وہ کیوں میں نے ہنی بیگم سے پوچھا۔۔۔ حاضرین میں سچ سننے کی اخلاقی جرأت نہ تھی۔ سٹیج پر ریٹائرڈ جرنیل، جج، پروفیسر، ماہرین معاشیات، کچھ حکومتی وزیر، سیکرٹری، چوٹی کے صحافی اور دانشور بیٹھے تھے جو سادگی، حقوق نسواں، انسانی حقوق اور خوشحال پاکستان والے سیمیناروں میں بھی موجود تھے۔ سامنے کی لائن میں پانچ پانچ بوائے فرینڈوں والی دس وی آئی پی خواتین اور چھ ہزار ڈالر کا سوٹ پہننے والے دانشور بھی موجود تھے۔ صائمہ کی تقریر جاری تھی جبکہ ہال میں اور اسٹیج پر بیٹھے خواتین و حضرات کے چہروں پر ندامت، شرمندگی، بدکرداری، بدعنوانی اور غلط بیانی کے رنگ آ اور جا رہے تھے۔ جنرل حمید گل کے ساتھ بیٹھے دانشور نے اپنا پانی پی کر جنرل حمید گل کے سامنے رکھا گلاس بھی خالی کر دیا اور پھر اُٹھ کر ہال سے ہی غائب ہوگیا۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جنرل حمید گل کے سوا کسی نے صائمہ کو داد نہ دی جبکہ ایک وزیر نے چٹ لکھ کر بھجوائی اور ہوٹل انتظامیہ نے ہال کی بجلی بند کر کے صائمہ کی سچی باتوں سے حاضرین سیمینار کی نجات کا بندوبست کیا۔ تم مشاہد حسین سیّد اور اُن کے ہم عصر دانشوروں کا پوچھ رہے تھے۔ صائمہ کہتی ہے کہ یہ لوگ دانشور نہیں بلکہ شاہی اصطبل کے سائیس ہیں جو سیاست کے اڑیل گھوڑوں پر اناڑی سواروں کو بٹھا کر انھیں منہ کے بل گرانے کا معاوضہ لیتے ہیں۔ احسن اقبال نے ویژن ٹونٹی ٹونٹی کا نعرہ لگایا اور مشاہد حسین اُن کے بھی حامی تھے۔ پہلے وہ محترمہ کے پیپلز پروگرام پر بھی اپنی مفکرانہ رائے دیتے رہے ہیں اور آجکل EEE (ای ای ای) کا شوشہ چھوڑ کر کلر سیداں اور پرانے باڑہ کو جانے والی پھٹیچر بسوں کی سولہ کروڑ سواریوں کی توجہ بریک فیل حادثے سے ہٹانے کی کوشش میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم تعلیم، معاشیات اور انتہا پسندی پر حملہ کرینگے۔ جس کا مطلب تعلیم اور معاشیات کے میدان میں انقلابی خوشحالی اور انتہا پسندی کا خاتمہ ہے۔ دراصل یہ سب مال کمانے کے حربے ہیں۔ پہلے ہم نے پڑھا لکھا پنجاب دیکھ لیا ہے جس پر کروڑوں کی اشتہار بازی ہوئی ہے۔ اب ای ای ای پر بھی اشتہار بازی، ورکشاپ بازی اور سیمینار بازی ہوگی اور کئی کروڑ ہضم کر لیے جائینگے۔ مشاہد صاحب فرماتے ہیں عنقریب عوام فیصلہ کرینگے کہ جنرل صاحب وردی میں رہینگے یا نہیں۔ اگلے سال دودھ کا دودھ اور پانی پانی ہوجائے گا۔ سرکاری دانشور سے کوئی پوچھے کہ بھائی ہمیں اُلو کیوں بناتے ہو۔ ہم تو پہلے ہی آپ کے کھیت کے آلو ہیں۔ اگر بس کی پچاس سواریاں ایک ان پڑھ اور جاہل ڈرائیور کو کاک پل پر کودنے سے منع نہیں کر سکتیں تو سولہ کروڑ کا بے ہنگم مجمع آپ کا کیا

کرلیگا۔آپ وردی پہنو یا اچکن انھیں پرواہ نہیں۔ یہ لوگ مرنے کیلئے پیدا ہوتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں۔آپ عیش کرو۔دلی جاؤ چین جاؤ پیرس جاؤ یا لندن اور واشنگٹن انھیں آپ کی بےفکری باتوں سے غرض نہیں۔

مشاہد حسین اوران کے ہم عصر مفکرین نے اپنے سیاسی ویژن اور دانشوری کی برکت سے بینظیر اور نواز شریف کا بیڑہ غرق کیا ہے اور اب مشرف صاحب کی باری ہے۔اللہ مشرف صاحب کو لمبی عمر دے مگر کل کا کسے پتہ۔آج مشائد حسین نواز شریف اور بینظیر کی غلط حکمت عملیوں اور سیاسی غلطیوں پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں تو کل یہی مشاہد حسین خلیل ملک،شاہد مسعود،طلعت حسین،طارق عزیز اور جنرل جاوید،جنرل کے ایم عارف اور جنرل چشتی کی طرح مشرف کی کمزوریوں اور خامیوں پر کتابیں لکھ کر ہمیں کسی اور کے آگے سجدہ ریز ہونے کی تبلیغ کرینگے۔

حال ہی میں جنرل مشرف نے لوگوں کو ھلال ایثار کا تمغہ دیا ہے جو کہ پچھلے سال آنے والے زلزلہ کے بعد کچھ لوگوں کی خدمات کو اجاگر کرنے کا ایک جذبہ سمجھا جارہا ہے۔سوال یہ ہے کہ جہاں کچھ لوگوں کی خدمات کو سراہا گیا ہے وہی مارگلہ ٹاور تعمیر کرنے والوں اور اس تعمیرات میں جن لوگوں نے رشوت اور کرپشن سے مال بنا کر سینکڑوں جانوں کی ہلاکت کا اہتمام کیا انھیں اور آزاد کشمیر میں زلزلہ زدگان کی مدد کیلئے بھجوایا جانے والا مال ہڑپ کرنے والوں کو بھی تمغہ حلال و جمال دے دیا جاتا تو بعد میں ایک اور تقریب منعقد کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صدر صاحب اپنے مشیروں اور مفکروں سے پوچھ کر چوھدری صاحبان کو شوگر میڈل بھی دے دیتے تو سولہ کروڑ کا مجمع اسپر بھی اعتراض نہ کرتا۔اب تو آزاد کشمیر کے صدر اوران کے یار غار چیئر مین احتساب بیورو جنرل سرفراز کرپٹ سیاستدان بچاؤ مہم کے پنجسالے پر پرائیڈ آف پرفارمنس کے بھی حقدار ہیں اور دونوں میں سے ایک یو این او کے سیکرٹری جنرل کے عہدے کیلئے کوالیفائی بھی کرتا ہے۔مظفر آباد کے غریب زلزلہ زدگان کا کہنا ہے کہ جو رقم ہلال ایثار کی تقریب پر خرچ ہوئی ہے اُس سے کم از کم سو گھر تعمیر ہو سکتے تھے مگر حکومت پاکستان کو آجکل سپیکر قومی اسمبلی کیلئے نو کروڑ کا گھر تعمیر کرنے کی زیادہ فکر ہے چونکہ آنے والے تاریخی اور شفاف الیکشن میں چوھدری صاحب کا کوئی نہ کوئی اہم رول ضرور ہے ورنہ اس سے کم شاہ خرچی کے جرم میں سابق سپیکر چاہ یوسف سے صدائیں دے رہیں ہیں۔حالانکہ ان کے جرائم کی لسٹ میں مرسڈیز گاڑیوں اور نو کروڑ کے محل کی تعمیر جیسا کوئی کارنامہ شامل نہیں۔تم نے فرزند سرحد گوہر ایوب اور اُنکے عزیز واقارب کے متعلق حبیب وہاب الخیری کے انٹرویو کا ذکر کیا تھا۔صائمہ نے اسپر طویل مضمون لکھ کر اخبارات کے ایڈیٹروں کو بھجوایا مگر کسی نے اسے شائع نہیں کیا چونکہ عمر ایوب غصے کا ذرا اتھرا ہے۔اس سے پہلے وزیر قانون اوران کا فرزندار جمند دوبار قانون ہاتھ میں لے چکے ہیں جب کہ ایم این اے سردار طفیل اوران کے صاحبزادے نے مری کے مال روڑ پر قانون نافذ کرنے والے کو ہسپتال پہنچا دیا ہے۔

آج کل ہر طرف اندھیر نگری ہے۔رشتے ناطے اور تہذیب واحترام آخری ہچکی لے رہے ہیں۔حکومت میں بیٹھے ہر شخص کو مادر پدر آزادی ہے اور قانون ان کے گرفت سے معذور ہے۔پہلے سنتے تھے کہ استاد باپ ہوتا ہے مگر فیصل آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر پرویز آصف اقبال اپنی ہی بیٹیوں کی عزت لوٹنے کے درپے ہے۔اسی مادر علمی کے دو بزرگ باپ ڈاکٹر مظفر اقبال اور پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ حبیب اللہ بھی اپنے وائس چانسلر کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔مگران مقدس باپوں کی شیطانی خواہشات پر پنجاب اسمبلی کی بھی گرفت نہیں چونکہ ان کے سر پر حاجی اور نمازی گورنر پنجاب کا سائیہ شفقت ہے۔صائمہ کا کہنا ہے کہ یہ پنگا بازی کا زمانہ نہیں۔یہ زمانہ روشن خیالی کا ہے۔بہتر ہے کہ اپنی عزت بچاؤ اور چپ رہو۔اگر عزت بچنے کا چانس نہیں تو کم از کم جان ہی بچاؤ۔اس ملک میں عام لوگوں کی غلطیوں پر انھیں بڑی بڑی سزائیں دیکر عدلیہ کا وقار بلند کیا جاتا ہے جبکہ گوہر ایوب اوران کے عزیزوں اور ہم عصروں کے جرائم پر آنکھیں بند کرنے میں ہی آفیت ہے۔

(۹)

پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے میں تم نے صائمہ کو دیکھا تھا بعد میں کبھی دیکھنے کا موقع ملا؟ ہنی بیگم نے پوچھا۔ ہاں ہنی میں نے دوبار پھر صائمہ بیگم کو دیکھا ہے۔ ایک بار گارڈن روڈ پر اور دوسری بار نہر کے پل پر۔ اتفاق سے دونوں بار وقت ایک ہی تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور واپڈا کے ملازمین نے دن کی روشنی ہی میں سٹریٹ لائٹ جلا رکھیں تھیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو ہمارے محلے میں لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے مگر سٹریٹ لائٹیں عصر سے پہلے ہی جلا دی جاتی ہیں چونکہ واپڈا ملازمین نے اور کام بھی کرنے ہوتے ہیں۔ ہنی نے کہا۔ میں نے دوبارہ صائمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گارڈن روڈ پر صائمہ ایک دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ تھی اور دونوں آہستہ آہستہ واک کرتیں جنوب کی سمت جا رہیں تھیں۔ میں قریب سے گزرا تو صائمہ نے مجھے پوری توجہ سے دیکھا مگر میں اسے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا اور تیز قدموں سے آگے چل دیا۔ دبلی پتلی اور سانولے رنگ والی لڑکی مسلسل باتیں کر رہی تھی اور صائمہ ایک لمبی تسبیح ہاتھ میں لئے ذکر میں مصروف تھی۔ میرے خیال میں تسبیح کی لمبائی صائمہ کے قد کے برابر تھی اور کم سے کم ہزار دانوں کی ضرور ہوگی۔ دوسری بار نہر کے پل پر اسی لڑکی کے ساتھ تو تھی مگر آگے آگے اک بچہ چل رہا تھا۔ بچہ خوبصورت تو نہیں تھا مگر بے حد معصوم اور انتہائی نورانی تھا۔ جب صائمہ میرے قریب سے گزری تو میں نے سلام پیش کیا۔ صائمہ چونکہ ذکر میں مصروف تھی اور تسبیح دوسرے ہاتھ کی مدد سے تھامے چل رہی تھی اس لئے منہ سے بولے بغیر پوری شفقت اور شاہانہ وقار سے سر کو جنبش دیکر میرے سلام کا جواب دیا اور اپنے مختصر قافلے کے ہمراہ سفر جاری رکھا۔ صائمہ جب میرے بہت قریب سے گزری تو یوں محسوس ہوا کہ اس کے ذکر کا سارا نور بچے کے چہرے پر اُمڈ آیا ہے۔ میرا جی تو چاہا کہ بچے کو دوبارہ دیکھوں مگر احتراماً میں ایسا نہ کر سکا اور پل کی دوسری جانب مسجد کی طرف چلا گیا چونکہ مغرب کا وقت قریب تھا۔۔ تمہارا مشائدہ کچھ ٹھیک ہے۔۔۔ صائمہ کوشش میں ہے کہ اس کے اندر کا نور پھر لوٹ آئے اور بغیر تزکیہ کیئے وہ پروفیسر اللہ لوک کے برآمدے کی پہلی سیڑھی تک رسائی حاصل کر لے مگر بہت سے دیگر مسائل اس کی توجہ منتشر کر دیتے ہیں۔ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت انتہائی جلالی ہوتا ہے جسے اکثر فقرا ز وال کا وقت بھی کہتے ہیں۔ اس وقت سوائے ذکر کے دیگر عبادات منع ہیں اسی لئے صائمہ بغیر بات کیئے ذکر کرتی ہے جس کا نور بچے پر منعکس ہو کر صائمہ کیلئے صرف صحیح راستے کی نشاندہی کرتا ہے مگر جب وہ ذکر سے فارغ ہوتی ہے تو ناسوتی قوتیں اسے پھر راستے سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔۔ ہنی اگر صائمہ روشنی کی طرف آنا چاہتی ہے اور راستے کی تلاش میں ہے تو پروفیسر اللہ لوک اس کی رہنمائی کیوں نہیں کرتے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ صرف صائمہ ہی نہیں وہ تو شبنم، شمع، سارا، زینت، سیما اور رمنا کی رہنمائی بھی کرنا چاہتے ہیں مگر ان سب کی مانگیں کچھ اور ہیں۔ صائمہ امیری اور فقیری دونوں چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی فقیری کی کرسی ڈالروں کے ڈھیر پر ہو اور کسی پیر صاحب کی طرح اسے پرلیس اور حکومت کی طرف سے پورا پورا پروٹوکول بھی ملے۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ کونسے پیر صاحب، پاکستان میں تو اب بہت سی گدیاں اور کرسیاں ہیں تم کس گدی اور کونسے پیر صاحب کی بات کر رہی ہو۔۔۔ یہ اندر کی بات ہے تم اسے چھوڑو۔۔۔ ساری گدیاں اور کرسیاں متبرک ہیں جیسے ہالہ والے مخدوم صاحب، شاہ جیونہ اور موسیٰ پاک کی گدیاں اور کرسیاں ہیں جن پر سیاستدان پیر بیٹھتے ہیں۔۔۔ نہیں ہنی۔۔۔ گدیاں متبرک ہیں کرسیاں ان کی ذاتی ہیں۔ تم پروفیسر اللہ لوک سے پوچھ لو۔ پوچھا تھا مگر وہ شبنم کے ساتھ باتیں کر رہے تھے اور اسے پوری توجہ دے رہے تھے مگر شبنم توجہ کے راستے سے ہٹ کر بیٹھی تھی چونکہ وہ توجہ کی طالب نہیں اسے صرف مالدار آدمی چاہئے۔ شبنم نے شمع، سارہ، سیما، زینت اور رمنا کو بھی سمجھا رکھا ہے کہ پروفیسر کی توجہ کی زد سے بچا جائے چونکہ پروفیسر اللہ لوک بھی راستہ دکھلاتے ہیں اور کچھ راستے بڑے ہی کٹھن اور جان لیوا ہوتے ہیں جن پر چلنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ صائمہ میں راستے کی تلاش اور منزل کے تعین کا مادہ موجود ہے۔ اگر کسی دن توجہ کے مرکز میں آ گئی تو منزل کے قریب ہو جائے گی اور راستہ بھی آسان ہو جائے گا جیسے مسز ہوگن اور مسٹر پیار علی کا راستہ بھی آسان ہو گیا اور منزل بھی مل گئی۔ ان دو ہستیوں کا تمہیں کیسے پتہ چلا میں نے ہنی سے پوچھا۔ مسز ہوگن کا واقعہ نور العرفان میں درج ہے یہ کتاب ڈاکٹر رمضان صاحبؒ اور صوفی نور الدین صاحبؒ نے لکھی ہے جس میں مولوی محمد امین صاحبؒ کشمیری کی روحانی زندگی کا ذکر ہے۔

راویان کتاب کے صفحہ ۳۵۲ پر لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۲ کے شورش کے زمانہ میں ہالی ووڈ امریکہ سے ایک بزرگ خاتون سرینگر تشریف لائیں اور جھیل ڈل میں محمد ابراہیم وانکو کی ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ وہ ہر روز ہاؤس بوٹ سے نکل کر سرینگر میں موجود درباروں اور آستانوں پر جاتی اور وہاں بیٹھے مولویوں۔ سادھوں، ملنگوں، جوگیوں اور جوتشیوں سے ملتی مگر کسی سے مطلب کی بات نہ پاتی۔ کافی روز قیام اور مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آنے کے بعد مسز ہوگن نے جناب محمد ابراہیم کو بتایا کہ ۱۹۲۵ میں جب میری عمر تیس سال تھی میں اپنے شہر ہالی ووڈ کے سب سے بڑے گرجے میں عبادت کیلئے گئی اور عبادت کے بعد میں گرجا کے صحن میں کرسی ڈال کر مراقبہ میں مشغول ہوئی تو غنودگی کے عالم میں دیکھتی ہوں کہ سامنے ایک بہت بڑا گرجا ہے اور عیسائی لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس گرجا میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں بھی گرجا میں داخل ہونے کیلئے آگے بڑھی تو ایک بزرگ نے مجھے روک کر کہا تم اس گرجے میں داخل ہونے کیلئے پیدا نہیں ہوئی۔ اس بزرگ نے دائیں جانب کی ایک عمارت کا اشارہ کیا جس کا رنگ سفید تھا اور چھت پر

سبز رنگ کا ایک گول گنبد صاف نظر آ رہا تھا کے متعلق کہا کہ تمہیں اس میں داخل ہونے کیلئے چنا گیا ہے۔ میں اس خوبصورت عمارت کے دروازے پر گئی اور اندر داخل ہونے پر پھر روک دی گئی۔ ایک نورانی چہرے والے بزرگ عمارت سے باہر آئے اور فرمایا کہ اس عمارت میں پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے اور اس میں داخلے کیلئے "ان صاحب" سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ میں نے اجازت دینے والی ہستی کی طرف دیکھا تو وہ ایک باریش، نورانی صورت، بڑی بڑی آنکھوں اور کشادہ پیشانی والے کسان تھے جو ایک کھیت میں ہل چلا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ شفقت سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلا رہے تھے۔ میں ان کے قریب گئی تو انہوں نے فرمایا کہ عمارت میں داخلے اور پارلیمنٹ میں شرکت کیلئے تمہیں میرا دین قبول کرنا ہوگا۔ میں نے تبدیلیے مذہب کا اقرار کیا اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ غنودگی ہٹ گئی اور مراقبہ ٹوٹ گیا۔ گھر آ کر مراقبے کی ساری کیفیت ڈائیری میں لکھی۔ مراقبے میں ملنے والی ہستی کی تلاش میں گھر سے نکلی اور افریقہ سے مشرق بعید تک سفر کیا مگر کوئی بھی ایسی دینی، روحانی اور علمی شخصیت نہ ملی جو مراقبے میں نظر آنے والی ہستی سے مماثلت رکھتی ہو۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ سے جاپان پہنچی اور وہاں کے مندروں، پگوڈوں اور معبدوں میں بیٹھے سادھوؤں سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تو مایوسی کی حالت میں واپس امریکہ چلی گئی کہ شائد مقدر میں کامیابی نہیں۔ اپنی ناکامی پر بے حد رنجیدہ اور مایوس تھی کہ ایک دن میرے والد نے خواب میں بشارت دی کہ ہندوستان چلی جاؤ وہاں تمہارے لئے کامیابی ہے۔ یہ ۱۹۴۷ کا زمانہ تھا ہر طرف شورش اور بدامنی تھی۔ تقسیم ہند کا عمل شروع تھا اور مہاجرین کے قافلے کسمپرسی کے عالم میں دونوں جانب رواں تھے۔ مہاجرین کی حالت زار دیکھ کر صدر امریکہ ہیری ٹرومین کو تار بھجوا کر مہاجرین کی مدد کی درخواست کی جس پر صدر نے مہاجرین کی بحالی کیلئے امداد بھجوائی۔ میں دہلی شہر میں گھومتی رہی۔ ہر مذہب کے عالموں، فقیروں، درویشوں اور سادھوؤں سے ملی مگر خواب کی تعبیر میسر نہ ہوئی۔ اسی دوران ایک ہندو عالم شانتا نندھا نے چھ مہینے تک اپنے آشرم میں گاؤ پوجا رکھشیا کرائی۔ کافی مجاہدہ کیا مگر مدعا حاصل نہ ہوا اور میں واپس امریکہ چلی گئی۔ مسز ہوگن نے محمد ابراہیم صاحب کو بتایا کہ پچیس سال تک مختلف ملکوں کی سیر کی اور ہر مذہب کے پیروکاروں سے ملی مگر خواب میں نظر آنے والی ہستی کا نام و نشان نہ ملا۔ طویل مایوسی اور مسلسل ناکامی کے بعد میں نے آخری قدم اٹھانے اور کشمیر جانے کا ارادہ کیا اور اب اس ہستی کی تلاش میں کشمیر کی خاک چھان رہی ہوں۔

مسز ہوگن کی بات سن کر ابراہیم صاحب اپنے ایک جاننے والے ڈی ایف او محکمہ جنگلات جناب راجہ سخی ولائت صاحبؒ کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ مسز ہوگن کی ملاقات قبلہ عالم جناب مولوی محمد امین صاحبؒ جن کا مسکن علاقہ کپواڑہ کا شیرہ شریف میں تھا سے کروائی جائے۔ راجہ سخی ولائت خان صاحبؒ حضور مولوی محمد امین صاحبؒ کے مرید خاص اور بامشائدہ ولّی تھے۔ آپ جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے اور اپنے مرشد کامل کے ہاں مسز ہوگن کی ملاقات کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹر محمد رمضان صاحبؒ مرحوم ومغفور لکھتے ہیں کہ یہ ۱۹۵۲ کا زمانہ تھا اور میں اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں پونہ بھارت میں تعینات تھا۔ یہ زمانہ کشمیر میں شورش اور بدامنی کا تھا اور مہاراجہ کشمیر کے خلاف بغاوت کی ناکامی کے بعد کشمیر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ میں رخصت لیکر گھر آیا اور اہل خانہ کی خیریت معلوم کرنے کے بعد حضور قبلہ عالمؒ کی خدمت میں کا شیرہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کا شیرہ کے باہر جنگل میں خیمہ بستی آباد ہے جہاں مسز ہوگن قبلہ سے ملاقات کیلئے تشریف فرما تھیں۔ مسز ہوگن قبلہ سخی صاحبؒ اور ابراہیم صاحب کی وساطت سے حضور قبلہ عالمؒ کے پیش ہوئیں اور اپنی خواب سے لیکر مشرق و مغرب کی سیر اور تلاش حق کے راستے میں پیش آنے والے واقعات بیان کرنے کے بعد کلمہ طیبہ پڑھ کر دائیرہ اسلام میں داخل ہو گئیں اور آپ کے ہاتھ بیعت ہوئیں۔

حضور قبلہ عالمؒ نے انہیں واپس سرینگر بھجوا دیا اور راجہ سخی ولائت خان صاحبؒ کو ہدایت کی کہ وہ انہیں اسلامی تعلیمات وآداب سے آگاہ کریں۔ راجہ سخی ولائت خانؒ کا تعلق ضلع میرپور سے تھا اور ان کے ہاں مسز ہوگن کو یہ سہولت بھی میسر تھی کہ آپ کی بیگم بھی امریکن انگریز تھیں اور دائیرہ اسلام میں داخل ہو کر اپنے محبوب خاوند کی صحبت میں بامشاہدہ بھی تھیں۔ راجہ صاحبؒ اور اُن کے اہل خانہ نے مسز ہوگن کو آداب شریعت وطریقت سے آراستہ کیا اور موسم سرما کے اختتام پر دوبارہ کا شیرہ شریف قبلہ عالمؒ کی خدمت میں پیش ہوئیں۔ قبلہ نے مسز ہوگن کو خلوت میں بیٹھنے کا حکم دیا اور ۲۹ دن کی مسلسل محنت، روزہ، شب بیداری اور تزکیہ کے بعد مسز ہوگن کا قلب کھلا اور مشائدہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ وقت سعید تھا جب مسز ہوگن کی پچیس سالہ تلاش حق کی کامیابی پر وہ مرد حق ملا جس نے عالم باطن میں اپنا روحانی تصور دیا تھا۔ مسز ہوگن ایک عرصہ تک کشمیر رہیں اور مسلسل تزکیہ ومجاہدہ اور ذکر الٰہی میں مشغول رہ کر پیر کامل واکمل کی رہنمائی ہیں روحانی منازل طے کرتی رہیں۔ اس وقت مسز ہوگن کی عمر تقریباً ستر برس تھی۔ کشمیر سے واپسی پر مسز ہوگن نے ہندوستان میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کی پیشگوئیاں کیں جو بعد میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔ واپس امریکہ جا کر اس معزز خاتون نے سب سے پہلے اپنے تین بیٹوں، بہوؤں اور اُن کے بچوں پر توجہ کی اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ نیک اور پارساماں کی اولاد یہ دعوت کیسے ٹھکراتی جبکہ مرشد کامل کی نظر اور حضورﷺ کی نورانی توجہ اس گھرانے پر پہلے سے مرکوز تھی۔ مسز ہوگن کا سارا خاندان مشرف بہ اسلام ہوا اور حقیقی زندگی کو اپنا کر جنت کا حقدار ٹھہرا۔ امریکہ جانے کے بعد مسز ہوگن ہالی ووڈ سے ایک سہ ماہی رسالہ (My Spiritual Experience) شائع کرتی رہیں جس میں حقیقی علم طریقت کے مضامین شائع کرتیں۔ مسز ہوگن کا قبول اسلام اور روحانی منازل کا پانا اس بات کی واضح اور سچی دلیل ہے کہ یہ راہ ملنا آسان نہیں۔ یہ راہ صرف اور صرف ایک مرد کامل کی رہنمائی سے ملتی ہے جس کیلئے تزکیہ نفس، مجاہدہ اور

خلوت گزینی کا عمل ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو ایمان لائینگے وہ آزمائے بھی جائینگے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اسے معرفت کی راہ پر ڈال دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انسان میں اس کی ذمہ داری کا احساس ہو اور فطری تحریک زندہ ہو۔ وہ تلاش حق کا حقیقی خواہاں ہو۔ جب انسان عزم و استقلال، جہد و قربانی، مصائب پر لبیک کہنے اور فطری تحریک کی تلاش میں حقیقت کو پانے کی صفات پیدا کر لیتا ہے تو اللہ کے نزدیک صراط مستقیم تک رہنمائی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ بغیر ان صفات کے کوئی بھی شخص منتخب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے رہبر کامل کی رہنمائی ہیں حقیقت کی منزل ملتی ہے۔

ہنی تم نے مسٹر پیار علی کا بھی ذکر کیا تھا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ہاں یہ بھی اسی نوعیت کا واقعہ ہے جو پچھلے ہفتے ایک نوجوان جنکا نام ولّی اللہ ہے نے بتایا۔ جناب ولّی اللہ خود ایک نوجوان درویش ہیں اور فطری تحریک خود اُن کی رہنمائی کر رہی ہے۔ ایسے نوجوان کا صابر شاکر اور ذاکر ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تھوڑی سی محنت انشاءاللہ انہیں بلند مقام اور مرتبے تک ضرور لے جائے گی جبکہ یہ نوجوان بچپن میں قبلہ محمد نور الدین اویسی امینی کشمیریؒ کی گود میں کھیل کر بڑا ہوا ہے۔ ولّی اللہ صاحب پچھلے ہفتے موضع سارو کی چیمہ ضلع گوجرانوالہ حضرت عامر عبدالرحمٰن چیمہ شہیدؒ کے مزار پر سلام پیش کرنے گئے تو وہی انہیں پتہ چلا کہ لالہ موسیٰ کے قریب ایک بستی میں حضرت سید عبداللہ شاہ سہروردی قادریؒ بھی آسودہ خاک ہیں جن کی مرقد پر حاضری کے بغیر واپس جانا مناسب نہیں۔ ولّی اللہ صاحب نے بتایا کہ ہالینڈ کے دو شہریوں کو جو کہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔ بیس سال پہلے خواب میں بشارت دی گئی کہ حضرت بری امامؒ جا کر عبداللہ شاہ صاحبؒ سے ملو۔ دونوں نوجوان انجینئروں نے مثل مسز ہوگن دنیا کی خاک چھان ماری مگر بری امامؒ اور عبداللہ شاہ صاحبؒ کا پتہ نہ ملا۔ یہ لوگ بھی پہلے بھارت گئے چونکہ یورپی ممالک میں بھارت بنگلہ دیش اور عرب ممالک زیادہ متعارف ہیں۔ بیس سال تک مسلسل ایک ہی خواب نے دونوں کو بے چین کیئے رکھا اور آخر کار انہیں کسی پاکستانی سے پتہ چلا کہ بری امامؒ کا مزار اسلام آباد کے نواح میں ہے۔ دونوں انجینئر دوست اسلام آباد آئے مگر مسئلہ حل نہ ہوا چونکہ بری امامؒ کا نام عبداللہ شاہؒ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے اسلام آباد ہی قیام کیا اور بری امامؒ کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ اسی دوران انہیں پتہ چلا کہ بری امامؒ کے احاطہ میں ایک درویش عرصہ تک مقیم رہا جن کا نام عبداللہ شاہ سہروردی قادریؒ تھا۔ چھ ماہ پہلے ان کا وصال ہو گیا اور رخصت سے پہلے انہوں نے وصیعت کی کہ انہیں لالہ موسیٰ کے قریب فلاں گاؤں میں فلاں جگہ فلاں کھیت کے کنارے فلاں درخت کے قریب دفنایا جائے۔ عقیدت مندوں نے ان کا جسد لالہ موسیٰ اسی مقام پر پہنچایا اور اس ویرانے میں سپرد خاک کر دیا۔ جس کا نام اب بری امامؒ ہی ہے۔ دونوں انجینئر لالہ موسیٰ پہنچے تو انہیں اپنے خواب کی تعبیر مل گئی۔ یہ وہی مقام اور مکان تھا جس کی تعمیر سے پہلے ہی انہیں بشارت مل چکی تھی۔ دونوں دوستوں نے سید عبداللہ شاہ سہروردی قادریؒ کی قبر پر بیٹھ کر کلمہ طیبہ پڑھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

دونوں انجینئر دوستوں میں سے ایک کا نام خواب ہی میں پیار علی تجویز کیا گیا تھا جبکہ دوسرے کا مسلم نام مخفی ہے۔ پیار علی اور اس کے دوست نے سید عبداللہ شاہؒ کا مزار تعمیر کروایا اور ارد گرد کی زمین خرید کر وسیع چار دیواری تعمیر کی تا کہ مزار کا احاطہ محفوظ رہے۔ عبداللہ شاہ صاحبؒ کے مزار کے قریب ایک ریٹائیرڈ پولیس کانسٹیبل طالب سائیں کا کچا مکان تھا جسے خرید کر احاطہ مزار میں شامل کیا گیا اور طالب سائیں کو مزار کی دیکھ بھال کا کام سپرد ہوا۔ پیار علی اور ان کے دوست اپنی منزل کو پہنچے تو ان کے عزیز رشتہ دار اور دوست انہیں چھور گئے۔ اب اللہ کے یہ دونوں بندے ہر سال اپنے مرشد کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور بندگان خدا کی خدمت کر کے راحت و سکون کی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہاں ہنی راستہ تو یہی ہے مگر ہر کسی کا ایسا نصیب نہیں ہوتا اور نہ ہر ایک ایسے کاموں کیلیئے منتخب کیا جاتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو ہنی نے جواب دیا۔ مگر انسان کی تلاش حق کی جستجو اور تھوڑی سی محنت اور چاہت بڑے صلے اور انعام کا موجب بن سکتی ہے۔ کیا پتہ صائمہ کے مقدر میں بھی کچھ لکھا ہو۔ بہر حال وہ متجسس ہے اور جستجو کا مادہ منزل کے حصول کی پہلی شرط ہے۔ انسان اگر ہر لمحہ تسبیح و عبادت اور تصور ذات الٰہی میں مشغول رہے تو ایک لمحہ اسے صدیوں کی مسافت پر محیط منزل کے قریب کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اپنے مقام کا احساس رکھتا ہو۔

باخبر شو از مقام آدمی

(۱۰)

ہنی تم نے کہا تھا کہ صائمہ نے بہت سے موضوعات پر ریسرچ کا ارادہ کیا اور پھر ایک کے بعد ایک پر ادھورا کام چھوڑ دیا۔ کیا کبھی صائمہ نے اپنے ریسرچ ورک پر پروفیسر اللہ لوک کی رائے لی یا پھر ان کے مشورے سے کوئی کام شروع کیا۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ہر بار پوچھا اور پھر اس پر کئی کئی دن بحثیں ہوتی رہیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا چونکہ سوائے سائنسی علوم کے باقی سب مضامین اپنی افادیت کھو رہے ہیں۔ سائنسی علوم کی بعض جہتوں نے انسان کی خدمت کے بجائے انسانی ذہن کی تنزلی کا سامان پیدا کیا اور انسانی اخلاقیات اور آداب میں بگاڑ پیدا کر کے اسے انسانیت کے اعلیٰ وارفعیٰ درجے سے گرا کر حیوانیت کے ادنیٰ درجے پر لا کھڑا کیا۔ کمپیوٹر جیسی حساس ٹیکنالوجی سے لیکر انسانی جان بچانے والی ادویات تک کوئی ٹیکنالوجی، کوئی ایجاد، کوئی ریسرچ ورک، کوئی انڈسٹری اور کوئی سوچ اور فکر ایسی نہیں جس نے انسانی عظمت وعزت کو بڑھایا ہو اور انسانی ذہن، سوچ، فکر اور فلسفہ حیات کو اس کی قدروں سمیت تسلیم کر کے اس کے روحانی مدارج کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کی ہو۔

سائنسی تحقیق وایجادات پر بھی جبر کا عنصر غالب ہے۔ ہر ملک اور قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تحقیق وجستجو کے میدان میں ترقی کرے اور جدید ٹیکنالوجی سے فیض حاصل کر کے غربت، جہالت اور بیماری سے نجات حاصل کرے اور قومی وقار وعظمت کے اصولوں کے تحت جیئے۔ اس بات سے کوئی بھی سنجیدہ شخص انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عظمت وتوقیر کا منبع و مخزن انسانی روحانی اقدار واخلاق ہے جس کے بغیر سائنسی ترقی اور عروج بے وقعت اور مضر انسانی اشیاء کی پیداوار کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں۔ علوم سائینسی ہوں یا معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی۔ ہر ایک کے پیچھے فلسفے اور منطق کی روح کارفرما ہوتی ہے اور فلسفہ اور منطق جب تک روحانی اور اخلاقی دائیرے میں نہ ہوں وہ کسی علم کو اس کی اصل روشنی کے تابع انسانی فلاح اور اصلاح کا کاربند نہیں بنا سکتا۔ آج دنیا میں سائینسی ترقی کے عروج کا زمانہ ہے مگر یہ ترقی وآسودگی روحانی اور اخلاقی دائیروں کی حدود سے باہر بنی نوع انسان کو رنگ ونسل، مذھب وتہذیب سے لیکر علاقہ وبرادری کی نچلی سطح تک تقسیم در تقسیم کے عمل کی چکی میں پیستی اسے انسانی، اخلاقی اور روحانی مدارج کی اعلیٰ ترین سطح سے گراتی تنزلی اور پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل چکی ہے جو انسان کا پیدائشی مقصد اور مرتبہ نہیں۔

صائمہ نے مشائد حسین کی خوبصورت پاکستانی جمہوریت سے لیکر دنیا کے تمام مروجہ جمہوری نظاموں کا مطالعہ کیا مگر حقیقی جمہوریت اور عوام کی حکمرانی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ برطانوی جمہوری نظام اب اپنے عوام کو بھی تحفظ فراہم نہیں کرتا اور عوامی نمائیندگان اور حکومت امریکہ اور اسرائیل کی متعین کردہ پالیسوں کو اپنانے اور ان پر اندھی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی تازہ مثال عراق پر فوج کشی اور مشرق وسطیٰ کے متعلق برطانیہ کی خارجہ پالیسی ہے۔ برطانوی عوام کی لاکھ مخالفت کے باوجود حکومت امریکی اور اسرائیلی پالیسی سازوں کے تسلط سے آزادی حاصل نہ کر سکی اور عراق اور افغانستان میں لاکھوں انسانوں کے قتل کا حصہ بن کر امریکی پالیسیوں کو دوام بخشنے کا آلہ کار بن گئی۔

امریکی، اسرائیلی اور بھارتی جمہوریتیں بھی دنیا میں مثالی نظام حکومت ہیں مگر حقیقت میں ان نظاموں کے پیچھے بھی قتل انسانی کا منصوبہ کارفرما ہے۔ جو سیاسی پارٹی اور شخصیات ان منصوبوں کی تکمیل کی کم سے کم بولی دیتے ہیں انھیں متعین وقت کے لیے حکومت کرنے کا لائیسنس مل جاتا ہے۔ آج ترقی یافتہ اور سائنسی عروج حاصل کرنے والی جمہوری اقوام اور ممالک نے ساری دنیا پر دھشت گردی کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے مگر کوئی دانشور اور تھنک ٹینک اس جنگ کے خاتمے اور فتح کا وقت متعین نہیں کر سکتا چونکہ مخالف قوتوں کی جنگی چالوں اور تدابیر سے ہی دنیا کے عقلمند واقف نہیں۔۔۔ ہنی اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ اس کی بنیادی وجہ بغض، استحصال اور تسلط ہے۔۔۔ اگر ترقی یافتہ اقوام اور سائینسی عروج حاصل کرنے والی قوتیں غریب اور ترقی پذیر اقوام اور ممالک سے بغض چھوڑ دیں، ان پر اپنی مرضی کے نظام ہائے حکومت اور معیشت مسلط نہ کریں اور ان کا استحصال کر کے انھیں اپنی حاسدانہ اور ظالمانہ پالیسیوں کا نشانہ بنانا چھوڑ دیں تو امریکہ جیسا ملک گھر بیٹھے دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ امریکی اور برطانوی جمہوریتیں افغانستان اور عراق پر کروڑوں ٹن لوہا اور بارود برسا کر بھی فتح کا جھنڈا نہ لہرا سکیں اور نہ ہی اسرائیلی اور بھارتی حکمران لاکھوں فلسطینیوں اور کشمیریوں کا خون بہا کر دہلی اور تل ابیب میں چین کی نیند سوتے ہیں۔ برطانیہ، امریکہ، بھارت اور اسرائیل جتنی آگ افغانوں، عراقیوں، فلسطینیوں اور کشمیریوں پر برساتے ہیں اس کی گرمی اور انسانوں کی جلتی لاشوں کی بو لندن، نیویارک تل ابیب اور دہلی میں بیٹھے حکمرانوں کو دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔ صائمہ کہتی ہے کہ اگر ووٹ کا استعمال استحصال، ظلم، جبر اور تسلط کا نام ہے تو ایسی جمہوریت پر ہزار لعنت۔

اب ذرا اپنے ملک کی طرف دیکھئے۔ یہاں مشائد حسین کی خوبصورت جمہوریت میں عوام کی مرضی پر شیطان کس طرح حاوی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کی طرف دیکھئے۔ شائد ہی کوئی ایسا ہو جو حلال کماتا ہو۔ ہمارے پارلیمینٹرین عوامی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں جو کہ اپنے معنی ومطالب کے لحاظ سے ہی ایک غلط اور دھوکہ دہی پر مبنی لفظ ہے۔۔۔ وہ کیسے ہنی۔۔۔ میں نے وضاحت چاہی۔۔۔ وہ ایسے کہ اخبار فروش یونین کا صدر خود اخبار فروش ہوتا ہے۔ ریڑی بانوں اور

دکانداروں کی نمائندگی کوئی ریڑی والا اور دکاندار ہی کرتا ہے مگر ہمارے کروڑوں غریب، مفلوک الحال اور بے روزگار لوگوں کی نمائندگی مل مالکان، بڑے بڑے جاگیرداراور زمیندار، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان ریٹائیرڈ جج، جرنیل، سمگلر، بدمعاش، نودولتیے اور بیوروکریٹ کرتے ہیں جو کہ جمہوریت کے ساتھ مذاق اور عوام کی توہین ہے۔ یہ لوگ اسمبلیوں میں جا کر اپنی تنخواہوں اور مراعات کا بل پاس کر کے اپنے لیے آسانیاں پیدا کرنے کا کام سب سے پہلے کرتے ہیں اور پھر باہم ملکر لوٹ مار کا بازار گرم کر کے عوام کی جیب سے بچا کھچا نکال کر یورپ، امریکہ، اور دبئی لے جاتے ہیں۔۔۔ مگر ہنی انھیں ووٹ تو عوام ہی دیتے ہیں۔ نہ دیں اور انھیں لوٹ مار کے مواقع فراہم نہ کریں۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ عوام مجبور اور یرغمال ہیں۔ وہ فرقوں، قبیلوں، برادریوں، اور بہت سی دیگر معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کی زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس کی تازہ مثال آزاد کشمیر کے حالیہ انتخابات ہیں۔ ایک نودولتیے لیڈر نے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخالف قبیلے کے درجنوں بے گناہ لوگوں کو کچھ عرصہ پہلے مختلف مقدمات میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا اور ایک پورے کا پورا گاؤں تباہ و برباد کیا جس میں ضلعی انتظامیہ اور معزز عدلیہ کے کچھ معزز اراکین بھی پوری طرح ملوث تھے اور بدمعاش لیڈر کی مکمل پشت پناہی کر رہے تھے۔ اب الیکشن سے پہلے لیڈر نے ان لوگوں کی عورتوں، بوڑھوں اور دیگر رشتہ داروں کو پیغام بھیجا ہے کہ اسے ووٹ دو ورنہ آدھے سے زیادہ لوگوں کو سزائے موت دلوا دونگا۔ لیڈر کی اس سازش سے صدر آزاد کشمیر، چیف الیکشن کمشنر اور چیف جسٹس تک سب واقف ہیں مگر کوئی اس کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتا چونکہ اس کی اپروچ حکومت پاکستان کے اعلیٰ ایوانوں اور اعلیٰ ترین شخصیات تک ہے جنھیں صرف مختاراں مائی میں دلچسپی ہے۔ آزاد کشمیر کے عوام پاکستانی حکمرانوں کی کسی لسٹ پر بھی نہیں اور نہ ہی انھیں ان سے کوئی سروکار ہے چونکہ پاکستانی حکمران طبقہ ایک ڈیل کے تحت اپنے ایجنٹوں کی مدد سے وہاں حکمرانی کرتا ہے۔

اسی الیکشن کے دوران ایک نجی ٹیلیویژن چینل کے نمائندے نے ایک آدمی سے پوچھا کہ آپ ووٹ ڈالو گے تو اس نے جواب دیا کہ ووٹ ڈالنے کو دل تو نہیں کرتا چونکہ ہمارے نمائندوں کے ایسے کرتوت نہیں کہ انھیں ووٹ دے کر اسمبلی میں عیش وعشرت کرنے بھیجا جائے مگر مجبوری ہے۔ بوڑھے نے بتایا کہ یہاں ہر گاؤں، محلے، گلی، اور برادری میں ٹاؤٹ اور بلیک میلر ہیں جنھوں نے ہمارے ووٹوں کی قیمت لے رکھی ہے۔ اگر ہم ان کے نمائندوں کو ووٹ نہیں دینگے تو وہ پولیس، پٹواری، اور دوسرے حکومتی محکموں میں بیٹھے اپنے کارندوں کی مدد سے ہمیں مقدمات میں پھنسا دینگے اور اگلے پانچ سال تک زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

قبضہ گروپوں، پلاٹ مافیا، سمگلروں اور معاشرے کے دیگر جرائم پیشہ گروپوں اور تنظیموں نے الیکشن پر مال لگایا ہوتا ہے اور الیکشن کے بعد وہ اپنے چنوائے ہوئے نمائندوں کی مدد سے عوام کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ کیا یہی جمہوریت ہے اور اسے تم عوام کے ووٹ اور مرضی کا نام دے سکتے ہو۔ یہ سب بلیک میلنگ ہے جسے مشاہد حسین سیّد صاحب خوبصورتی کہتے ہیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کہہ کر کروڑوں بے شعور اور مجبور لوگوں کی غیرت ایمانی کا مذاق اڑاتے ہیں۔۔۔ ارض مقدس پر اگر عزت سے جینا ہے تو ہر کسی کو مافیا کی حکمرانی تسلیم کرنا ہوگی اور اپنا دین وایمان گروی رکھ کر صرف وطن کی مٹی اور ہوا کی خاطر مافیا کے آگے سر جھکانا ہوگا۔ جس ملک میں مافیا سیاست، حکومت اور عدالت پر کنٹرول کرتا ہو وہاں کے عوام کو بش اور بلیئر سے کوئی خطرہ نہیں اور نہ ہی مغرب اور مشرق کے کروسیڈ کو ان پر حملہ آور ہونے کی ضرورت ہے۔ موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان سے ہر مجبور، بے بس اور بے آسرا شخص کی ایک امید سی بندھ گئی ہے مگر ایک آدمی جسکے مرتبے اور منصب کی کچھ مجبوریاں بھی ہیں شائد ہر کسی کی دادرسی کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی ہی امیدیں چھ سال پہلے جنرل مشرف سے بھی بندھی تھیں مگر چھ سالوں میں جنرل نے چھ ہزار رنگ بدلے اور آج نت ہاؤس گجرات کے قیدی کی حیثیت سے حکمرانی کر رہے ہیں۔ جنرل مشرف اپنے آپ کو کمانڈو اور باوردی صدر کہتے ہیں مگر یہ سب ان کی ذات کی حفاظت کیلئے ہے عوام کی فلاح، عزت اور آزادی کیلئے نہیں۔ صائمہ کہتی ہے کہ جنرل مشرف عملاً مافیا کی قید میں ہیں اور وہ بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔ ہنی اگر جنرل مشرف اچھے آدمی ہیں اور عوام کی خدمت کرنے کی جرأت اور صلاحیت رکھتے ہیں تو انھیں نت ہاؤس اور مافیا کی قید سے آزادی کیسے دلائی جا سکتی ہے۔۔۔ یہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔۔۔ ہنی نے کہا۔۔۔ یہ کام عدلیہ، تقدیر اور عوام کر سکتے ہیں مگر اس کی وضاحت انتہائی مشکل ہے۔۔۔ تقدیر کے ساتھ ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے اور تدبیر کیلئے ایک مخلص مدبّر کی ضرورت ہے جو عوام میں سے ہو وی آئی پی نہ ہو۔ مگر عوام کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے کو مدبّر نہیں سمجھتے چونکہ انھیں وی آئی پی لوگوں کی غلامی کا نشہ ہو گیا ہے۔ صائمہ کہتی ہے کہ ہماری سرزمین انقلابات کی نہیں سازشوں کی ہے اور عوام سازشی حکمرانوں اور مدبّروں کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنا گھر اس لیے جلاتے ہیں تا کہ ایک چنگاری اڑ کر پڑوسی کا مکان بھی جلا دے، وہ غنڈے سیاستدان کو ووٹ دیتے ہیں تا کہ وہ ان کے مخالفین کو مقدمات میں پھنسا کر جیل بھیج دے۔ وہ لاکھوں روپے ادھار لیکر بیٹی کی شادی کرتے ہیں تا کہ بہت سے وی آئی پی لٹیرے اور سیاستدان اس تقریب میں آ کر ان کی جھوٹی شان کو بڑھائیں اور محلے میں اس کا ٹہکہ ہو۔ صائمہ کہتی ہے کہ جب معاشرے میں بغض اور برائی کو عزت کی علامت تصور کیا جانے لگے تو وہ معاشرہ مہذب نہیں رہتا اور نہ ہی اس کی اصلاح ممکن رہتی ہے۔ ایسے معاشرے کی موت سے ہی ایک نیا معاشرہ جنم لیتا ہے مگر اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

ہماری تاریخ سازشوں کی تاریخ ہے جسے بدلنے کی کسی حکمران اور لیڈر نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ قائداعظمؒ کے بعد خواجہ ناظم الدین کی خواہش تھی کہ وہ ایک بے

ہنگم کراوڈ کو قوم میں تبدیل کریں مگر قائد کو زندگی نے اور خواجہ ناظم الدین کو سازشیوں نے مہلت نہ دی۔۔۔ہنی بھٹو بھی تو بڑے لیڈر تھے۔۔۔ تھے مگر متکبرانہ جاگیردارانہ سازشی ذہن بھی رکھتے تھے اور اسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔۔۔ وہ کراوڈ پسند کرتے تھے قوم نہیں چاہتے تھے۔۔۔ وہ بے حس اور بے ہنگم لوگوں کے نعروں اور تالیوں میں جینا چاہتے تھے۔ وہ عوام کے جذبات سے کھیلنا پسند کرتے اور انھیں اپنی ڈگڈگی کی ٹھن ٹھن پر نچاتے اور خوش ہوتے تھے۔ بھٹو اکھاڑ پچھاڑ پسند کرتے تھے۔ وہ کسی کو اپنے قریب اور برابر بٹھانے اور اونچی آواز میں بولنے نہیں دیتے تھے۔ وہ ایسی قیادت کے رہبر بن کر حکمرانی کرنا چاہتے تھے جو ان کے آگے سجدہ ریز رہے اور اُن کے حکم پر کٹ مرے اور مار دے۔ الطاف بھائی ان کے سچے جانشین ہیں اور ان کے فلسفہ سیاست کو کراچی کی حد تک عملی جامہ پہنائے ہوئے ہیں۔ بھٹو صاحب کو تنقید پسند نہ تھی۔ وہ تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور اس مٹی کے مادھوں کی نفسیات جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ائیر مارشل اصغر کو کہا کہ عقل کرو اور میرے ساتھ مل جاؤ ہم زندگی بھر اس ملک پر حکومت کرینگے۔۔۔ اصغر خان مان جاتے تو کیا ’برا تھا میں نے پوچھا۔۔۔ بھٹو کی جگہ اصغر خان پھانسی چڑتے۔ بھٹو نے دعوت تو دی تھی مگر وہ اقتدار میں شراکت پسند نہ کرتے۔ جس طرح بھٹو مٹی کے مادھوں کی نفسیات سمجھتے تھے ویسے ہی اصغر خان بھٹو کی نفسیات سے واقف تھے۔۔۔ اسی لیے صائمہ کہتی ہے کہ یہ سازشوں کی سرزمین ہے انقلابوں کی نہیں۔ سازشیں کرنے والے ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے جبکہ انقلاب بھرپا کرنے والے قبر تک ساتھ نبھاتے ہیں۔ وہ جسے لیڈر مانتے ہیں اُسے راہ راست پر بھی رکھتے ہیں ذلیل و رسوا نہیں ہونے دیتے۔ بھٹو صاحب نے اس ملک کو نو دولتیا اور جیالہ سیاسی کلچر دیا جسے رسوائی کا ڈر نہیں ہوتا۔ ہر عزت دار کو رسوا کر کے ساتھ ملانا ان کے سیاسی ویژن کا حصہ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ضیاء الحق نے کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر دیا مگر وہ یہ بھول رہے ہیں کہ اس کلچر کو نو دولتیوں اور جیالوں نے اپنایا اور موجودہ حکمرانوں نے اسے مافیا کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے سامنے ہتھیار ڈال کر عوام کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ احتساب والے بھی ایک عدالت ہی ہیں جو جسے چاہتے ہیں وزارت دلوا دیتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں سزا دلوا کر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ کچھ کو یوں ہی معاف کر دیتے ہیں اور کچھ سے ڈیل ہوتی ہے مگر مافیا کو اس لیے نہیں چھیڑتے کہ وہ غصے میں چینی اور مہنگی کر دینگے۔۔۔ہنی تم تاریخ کی بات کر رہی تھی کیا ہم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے اور ایسے ہی رہینگے۔۔۔ ہماری تقدیر کبھی نہ بدلے گی۔ ہم مافیا کی سازشوں اور بے انصافیوں کی زندگی جی کر حسرت و یاس کے عالم میں مر جائینگے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ہاں بھائی ہمارا یہی مقدر ہے۔۔۔ ہم ایسے ہی جئیں گے اور ایسے ہی مرینگے چونکہ جس خطہ زمین پر ہم پیدا ہوئے وہاں انسانوں کا جم غفیر ایسی ہی زندگی کا خواہاں ہے۔ وہ خان، ملک، چوھدری، وڈیرے، پیر مخدوم، جنرل صاحب اور صاحب بہادر کے آگے ہاتھ پھیلانے اور ان کی غلامی میں زندہ رہنے کا عادی ہے۔ وہ اس غلامی اور ذلت کو اپنا مقدر سمجھتا ہے اور ان کی خدمت اور چاکری میں فخر محسوس کرتا ہے۔ صائمہ کہتی ہے یہ آج کی نہیں صدیوں کی روایات ہیں جنھیں یہ جم غفیر توڑنا نہیں چاہتا۔۔۔ صائمہ نے کیا پڑھا ہے۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ وہی جو مشائد حسین نے پڑھ رکھا ہے۔۔۔ صائمہ کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے سات صدیاں پہلے سکندر اعظم یونان سے آیا اور مزار شریف سے ہوتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو پریشان ہو گیا چونکہ آگے وسیع ہندوستان کے متعلق اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کس قدر افواج کھلے میدانوں اور دریاؤں کے کناروں پر اسکا مقابلہ کرینگی۔ سکندر کے ہراول دستے تربیلہ کے گاؤں قاضی پور کے سامنے دریا پر پہنچے تو دو عظیم اور تاریخی دریاؤں کے درمیان پھیلی سلطنت کا راجہ خود سکندر کے استقبال کے لیے موجود تھا۔۔۔ یہ کون تھا میں نے پوچھا۔۔۔ تاریخ میں اس کا نام راجہ امبی لکھا ہے۔ اس کی سلطنت سندھ اور جہلم کے دریاؤں کے درمیان تھی جبکہ اسکا خالہ زاد پورس باقی ہندوستان کا حکمران تھا اور راجہ امبی پورس سے بغض رکھتا تھا۔ راجہ امبی فوجی قوت میں پورس سے کمزور تھا اس لئے اس نے سکندر کی آمد کو غنیمت جانا اور دریا پار اس کا استقبال کر کے اسے پورس پر حملہ کرنے کے لیے مدد فراہم کی۔ پورس کے ہاتھی یونانی توپوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور الٹے پاؤں اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ ہماری تاریخ ایسی ہی سازشوں اور فتنوں کے ابواب پر مشتمل ہے اور آج ہمارے حکمران اس میں نئے باب کا اضافہ کر رہے ہیں تاکہ راجہ امبی۔ میر جعفر، میر صادق، پورنیہ، شیخ عبداللہ اور شیخ مجیب کے کردار تاریخ سے مٹ نہ پائیں۔

صائمہ کہتی ہے محمود غزنوی سومنات کی فتح کے بعد غزنی جاتے ہوئے لاہور پہنچا تو بیماری نے زور پکڑا اور بادشاہ پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ شاہی طبیبوں نے لاہور کے گورنر ایاز کو مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح محمود کو لاہور ہی روک لے چونکہ اب وقت رخصت قریب ہے۔ سفر میں بادشاہ کی موت کئی فتنوں کا سبب بن سکتی ہے اور لاہور میں وفات کی صورت میں کفن راز داری سے غزنی پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایاز نے محمود کو خبر دی تو اس نے تقدیر کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور کچھ روز لاہور میں قیام کا اعلان کر دیا۔ اسی قیام کے دوران ایاز نے محمود سے پوچھا کہ اس کی اگلی خواہش اور منصوبہ کیا تھا۔ محمود نے کہا کہ وہ کچھ عرصہ آرام کے بعد لاہور کو آگ میں جھونکنا چاہتا تھا اور اس صوبے میں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کرنا چاہتا تھا کہ کوسوں کے فاصلے پر ہی کوئی اس کی تیغ سے بچ پاتا۔ محمود کی اس خواہش پر ایاز حیران ہوا اور عرض کیا۔ حضور یہ خطہ زرخیز ہے یہاں بہتے دریا اور لہلہاتے کھیت ہیں۔ شہروں میں منڈیاں ہیں سرائیں ہیں باغات اور بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ آپ انھیں کیوں تباہ کرنا چاہتے تھے۔ محمود نے کہا! اے دوست یاد رکھ منڈیوں، سراؤں، دریاؤں، باغوں اور عمارتوں سے قومی کردار نہیں بنتا۔ یہ زمین سازشوں کی زمین ہے یہاں انقلاب نہیں آتے۔ یہ لوگ ہر حملہ آور کو محض اس لیے خوش آمدید کہتے ہیں کہ ان کے کھیت کھلیان بچ جائیں۔ یہ حملہ آوروں سے رشتہ داریاں قائم کرتے ہیں اور اپنے مخالفین کی عزتوں سے کھیلتے اور ان کی عورتیں حملہ آوروں کو تحفے میں دیتے ہیں۔ جب

تک ان سازشی عناصر کی ایک نسل تہہ تیغ نہیں ہوتی ان میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے اور مٹی کی عزت وآبرو کا احساس پیدا نہیں ہوگا۔ دیکھو میں صائمہ کی تحقیق سے متفق ہوں اس ملک میں ترقی اور خوشحالی کے کوئی آثار نہیں جبکہ عوام مختلف سازشی گروپوں میں تقسیم ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ جب کسی خطہ زمین پر بسنے والے اجتماعی خودکشی کو خوشحالی تصور کرلیں تو ان پر بیرونی قوتیں بھی حملہ آور نہیں ہوتیں۔ اس ملک کی تقدیر صرف احساس، انقلاب، عدالت اور احتساب کے ذریعے بدلی جاسکتی ہے جس کے فی الحال کوئی آثار نہیں۔۔۔۔